اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

اپریل (۲۰۰۶ء)

اقبال ریویو

خصوصی پیش کش

اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط

(چند معاصرین حیدرآباد کے نام)

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۰۶ء)

اقبال ریویو

خصوصی پیشکش

اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط

(چند معاصرین حیدرآباد کے نام)

جلد (۱۵) شمارہ (۱)

ISBN.81-86370-30-7

مجلس مشاورت

۱۔ پروفیسر سید سراج الدین
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)
۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
۲۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
۳۔ سید امتیاز الدین۔ ایڈیٹر

بدل اشتراک

فی شمارہ ۴۰ روپئے ایک سال (دو شمارے) ۷۵ روپئے
بیرونی ملک فی شمارہ، ۵ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد۔ 500028
آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون: 55663950
e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، انجم راہی ''شارپ کمپیوٹر'' محبوب بازار، چادرگھاٹ حیدرآباد۔ ۲۔ فون: 9392427796

وی جی پرنٹر دلسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
اداریہ	محمد ظہیر الدین	۵
گوشۂ علامہ عبداللہ عمادی		
۱۔تعارف	ادارہ	۱۰
۲۔مکتوب اقبال۔عکس تحریر اور متن	،	۱۲
۳۔علامہ عمادی اور اقبال	سید امتیاز الدین	۱۹
گوشۂ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد		
۱۔تعارف	پروفیسر زینت ساجدہ	۲۳
۲۔مکتوب اقبال۔عکس تحریر اور متن	.....	۲۵
۳۔اقبال کا شاعرانہ فلسفہ	پروفیسر ابوظفر عبدالواحد	۲۹
گوشۂ پروفیسر غلام دستگیر رشید		
۱۔تعارف	محمد ظہیر الدین	۳۹
۲۔مکتوب اقبال۔عکس اور متن		۴۳
۳۔صبح مراد! اردو نثر کا اقبال	پروفیسر غلام دستگیر رشید	۴۵
گوشۂ ڈاکٹر سید عبدالطیف		
۱۔تعارف (تذکرۂ معاصرین سے تلخیص)	مالک رام	۵۳
۲۔مکاتیب اقبال		۵۶
۱۔مکتوب مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۵ء	عکس، متن اور ترجمہ	۵۷
ب۔مکتوب مورخہ ۳۱/ڈسمبر ۱۹۳۵ء	عکس، متن اور ترجمہ	۶۰
ج۔مکتوب مورخہ ۱۷/ستمبر ۱۹۳۷ء	عکس، متن اور ترجمہ	۶۳

۳۔ڈاکٹر لطیف! چند یادیں	محمد ظہیر الدین	۶۶
۴۔اقبال سے ملاقات۔سفر لاہور	ڈاکٹر سید عبداللطیف	۷۱
۵۔اقبال کا مسلک انسانیت (Humanism in Iqbal)	ڈاکٹر سید عبداللطیف ترجمہ: سید امتیاز الدین	۷۵
۶۔شاعر اقبال اور اس کا پیام Iqbal: The Poet & his message	ڈاکٹر سید عبداللطیف ترجمہ: سید امتیاز الدین	۸۱

اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیاں

ا۔ ڈاکٹر محمد سہیل عمر ڈائرکٹر اقبال اکادمی کی آمد و تاثرات		۸۵
ب۔اجتماعات، کتب خانہ و نئی مطبوعات غیرہ		
ج۔اقبال ریویو۔خصوصی پیش کش پر تبصرہ	پروفیسر عقیل ہاشمی	۸۹
اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیاں چند مناظر		۹۴

○○○○

اداریہ

محمد ظہیر الدین

اقبال کے چند غیر مطبوعہ خطوط

(معاصرین حیدرآباد کے نام)

اقبال ریویو کا زیر نظر شمارہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شمارہ میں معاصرین حیدرآباد کے نام اقبال کے چند غیر مطبوعہ خطوط کے عکس پہلی مرتبہ پیش کئے جارہے ہیں۔ قبل اس کے کہ پیش کردہ خطوط کے بارے میں چند ضروری باتیں عرض کی جائیں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اقبال اکیڈیمی کی مساعی کے نتیجہ میں اس سے پہلے بھی بعض اہم اور نادر خطوط آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے ذخیرہ سے حاصل کرتے ہوئے دیگر تحقیقی مواد کے ساتھ پہلی مرتبہ پیش کئے گئے تھے۔ یہ خطوط آرکائیوز کے امسلہ میں محفوظ تھے۔ جو جناب سید شکیل احمد کی تحقیق اور کاوش کی وجہ سے دستیاب ہوسکے یہ سات خطوط موصوف کی گرانقدر کتاب ''اقبال نئی تحقیق''، مطبوعہ مارچ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئے۔ جس کو اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے شائع کیا تھا۔ ان سات خطوط کی تفصیل اس کتاب میں دی جاچکی ہے۔ تاہم اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے یہاں اس کا اجمالاً تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

تاریخی اعتبار سے اقبال کے ان سات خطوط کی تفصیل درج ذیل ہے

	تاریخ	مکتوب الیہ
۱۔	۹/دسمبر ۱۹۲۸ء	(غالباً) بہ نام رجسٹرار جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد میں لکچرس کے سلسلہ میں۔
۲۔	۲۱/دسمبر ۱۹۲۸ء	ارباب جامعہ عثمانیہ کے نام لکچرس کے عنوانات کے بارے میں۔
۳۔	۲۶/فروری ۱۹۲۹ء	سرامین جنگ کے نام۔ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کو امداد کے سلسلہ میں۔
۴۔	۳/جنوری ۱۹۳۰ء	جناب حمید احمد رجسٹرار جامعۂ عثمانیہ کے نام۔ لکچرس کے سلسلہ میں اقبال نے معذوری کا اظہار کیا۔

۵۔ ۲رمئی ۱۹۳۱ء
۶۔ ۱۴رمئی ۱۹۳۱ء
۷۔ ۲رفروری ۱۹۳۷ء
} یہ تینوں خطوط سر اکبر حیدری کے نام ہیں جو اقبال نے مالی اعانت کے لئے آفتاب اقبال کی درخواستوں کے سلسلہ میں سر اکبر حیدری کے خطوط کے جواب میں لکھے تھے۔

اول الذکر چار خطوط کی نقول سرکاری امسلہ میں دستیاب ہوئیں۔ البتہ موخر الذکر تین خطوط اصلی حالت میں آرکائیوز کی امسلہ میں محفوظ ہیں اور جن کے عکس ''اقبال نئی تحقیق'' میں شائع ہوئے۔ اس کتاب پر مقدمہ جناب مصلح الدین سعدی نے تحریر فرمایا تھا۔ جس میں دیگر تفصیلات دی گئی ہیں۔ اقبال اکیڈیمی نے معاصرین حیدرآباد کے نام جو خطوط لکھے تھے ان کی تلاش کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مزید خطوط دستیاب ہوئے۔ ان خطوط کے عکس اور متن ضروری تعلیقات کے ساتھ زیر نظر شمارہ میں پیش کئے جارہے ہیں۔ ایک طویل عرصہ سے یہ خطوط اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے کتب خانہ میں محفوظ تھے لیکن بوجوہ شائع نہیں کئے جاسکے۔ ان خطوط کے بارے میں ضروری باتیں معزز قارئین اور اقبالیات کے طالب علموں کی معلومات کے لئے پیش کی جارہی ہیں

۱۔ مکتوب بہ نام علامہ عمادی، مورخہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۸ء

اس مکتوب کا عکس مولانا عمادی کے بھتیجے جناب محمد عبدالقادر عمادی مرحوم نے عنایت فرمایا تھا۔ موصوف انوار العلوم کالج اور اس کے بعد حیدرآباد یونیورسٹی میں سماجیات کے استاد تھے اور اکیڈیمی کی سرگرمیوں سے بھی وابستہ تھے۔ موصوف نے بتایا کہ اصل خط ان کے بڑے بھائی کے پاس محفوظ تھا۔ جسے عکس کے حصول کے بعد موصوف نے واپس کردیا۔

۲۔ مکتوب بہ نام پروفیسر ابواظفر عبدالواحد، مورخہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۱۸ء

یہ مکتوب محترمہ بشیر النساء بشیر کے ذخیرہ میں محفوظ رہا۔ مرحومہ کے شوہر جناب ضامن علی غازی نے اکیڈیمی کے ریکارڈ کے لئے راقم الحروف کے حوالہ فرمایا تھا۔ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر ایک صاحب نظر اور دردمند دل رکھنے والی شاعرہ تھیں۔ ان کا مجموعہ کلام آبگینہ شعر کے نام سے شائع ہوا۔ وہ اقبال کی پرستار تھیں۔ اقبال پر انہوں نے متاثر کن نظمیں لکھیں۔ جناب ضامن علی غازی نے اصل خط اس وعدہ کے ساتھ واپس لے لیا تھا کہ یہ خط ان کے پاس امانتاً محفوظ رہے گا۔ لیکن موصوف کے انتقال کے بعد اس کا حصول ممکن نہ ہوسکا۔ تاہم اس وقت اقبال کے خط کا

عکس حاصل کرلیا گیا تھا۔

۳۔ مکتوب بہ نام پروفیسر غلام دستگیر رشید مورخہ ۲/مارچ ۱۹۳۵ء

اصل خط مرحوم نے اکیڈیمی کے ریکارڈ کے لئے راقم الحروف کو عنایت فرمایا تھا۔ اصل خط اکیڈیمی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۴۔ مکاتیب بہ نام ڈاکٹر سید عبداللطیف مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۵ء، ۱۳/دسمبر ۱۹۳۵ء، و ۱۷/ستمبر ۱۹۳۷ء

علامہ اقبال اور ڈاکٹر لطیف کے روابط خصوصی اہمیت کے حامل رہے۔ اقبال کی دعوت پر ان سے ملاقات کے لئے ڈاکٹر لطیف نے ۱۹۳۷ء میں لاہور کا سفر بھی کیا تھا۔ جس کی تفصیل ان کے ایک مضمون سے ملتی ہے۔ جو اس شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔ کئی اہم موضوعات خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی مسائل دونوں کے درمیان قدر مشترک رہے۔ خصوصاً ڈاکٹر لطیف کے مقالوں ''ہندوستان میں اسلامی تہذیب'' اور ''ہندوستان اور اس کا تہذیبی مستقبل'' (انگریزی مقالوں کے تراجم) کا مطالعہ اقبال کے خطبات صدارت الہ آباد: ۱۹۳۰ء اور آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء کے تناظر میں کیا جائے تو دونوں کے مابین اہم فکری رشتے اجاگر ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اقبال اور ڈاکٹر لطیف کے درمیان خط و کتابت محفوظ نہ رہ سکی۔ اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ڈاکٹر لطیف نے اقبال کو طویل خطوط لکھے، جس کا اندازہ اقبال کے خط مورخہ ۱۱/ستمبر ۱۹۳۷ء سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے ڈاکٹر لطیف کے خط کے صفحہ نمبر گیارہ پر بیان کردہ ایک نکتہ کی وضاحت چاہی تھی۔ ان خطوط کے نقول دستیاب نہیں ہیں، البتہ ڈاکٹر لطیف کے پاس اقبال کے تین خطوط محفوظ رہ گئے، جس کا تذکرہ انہوں نے اور لوگوں کے اس طالب علم سے بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر لطیف کے انتقال کے بعد یہ خطوط اور دیگر اہم امسلہ ان کے قائم کردہ ٹرسٹ کے صدر نشین ڈاکٹر حسن الدین احمد سابق آئی اے ایس کی تحویل میں آ گئے۔ ۱۹۷۳ء میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام صدی تقاریب کے ضمن میں منعقدہ نمائش کے لئے موصوف نے ان خطوط کی نقول (فوٹو کاپی) عنایت فرمائیں جو اس نمائش میں پہلی مرتبہ پیش کی گئیں۔ بعد میں یہ خطوط ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اقبال اکادمی پاکستان کی نذر کردیئے جو عجائب گھر لاہور کی جانب سے مطبوعہ ''نوادر اقبال''۔ مطبوعہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئے۔ ان خطوط کے اردو تراجم بغیر انگریزی

متن کے ''کلیات مکاتیب اقبال'' جلد چہارم مرتبہ مظفر حسین برنی میں شامل کئے گئے۔

زیر نظر شمارہ میں ان چار معاصرین کے نام خطوط کے عکس، متن اور تعلیقات تعارفی خاکوں کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں۔ ان کے علاوہ، مکتوب الیھم کے منتخب مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں تاکہ اقبال کے بارے میں ان کے خیالات اور تاثرات سے واقفیت ہو سکے۔ تاہم ان مضامین کے مطالعہ کے وقت فصلِ زمانی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ امید ہے کہ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی یہ خصوصی پیشکش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ادارہ اقبالیات کے اسکالرس اور اہل علم کی گرانقدر رائے اور مشوروں کا متمنی ہے۔

○○○○

علامہ عبداللہ عمادی

ادارہ

مولانا عبداللہ عمادی

(وفات ستمبر ۱۹۴۷ء مطابق شوال ۱۳۶۶ھ)

غیر منقسم ہندوستان میں ریاست حیدرآباد آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے دورِ حکومت میں اپنی علم دوستی اور علماء کی سرپرستی کے لئے سارے ملک میں ممتاز مقام رکھتی تھی۔ زبان وادب، علم وفنون کی جس قدر خدمت اس عہدِ زرین میں فرماں روائے دکن نے کی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ کئی جامعات اور تعلیمی ادارے نظام دکن کی فیاضی سے بہرہ مند ہوئے بلکہ اکثر تو ایسا بھی ہوا کہ کوئی قابل قدر ادارہ نامساعد حالات کی وجہ سے بند ہونے کو تھا لیکن میر عثمان علی خان کی بروقت امداد سے اس کو نئی زندگی ملی۔ یہی حال علما وفضلا کا تھا جو ملک کے مختلف حصوں میں تنگ دستی کا شکار تھے۔ انہوں نے ریاستِ حیدرآباد کا رخ کیا۔ یہاں ان کی مناسب پذیرائی ہوئی۔ اس طرح صاحبانِ علم کو ریاست سے اور ریاست کو ان کے علم وفضل سے بے حد فیض پہنچا۔

شاعروں ادیبوں اور اہلِ علم کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے اپنی عمر عزیز کے گراں قدر ایام ریاستِ حیدرآباد کی ملازمت میں گزارے ہیں بہت سے حضرات ایسے ہیں جو وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن واپس ہو گئے لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے سرزمین دکن کو وطنِ ثانی بنالیا اور بعد وفات یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ علامہ عبداللہ عمادی مرحوم کی ہستی بھی وہ گنجِ گراں مایہ ہے جو آج بھی حیدرآباد میں آرام فرما ہے۔

مولانا عمادی جونپور کے ایک گاؤں امرتھوا کے رہنے والے تھے۔ ان کے جد امجد کا نام شیخ عماد الدین تھا۔ اسی مناسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ عمادی لکھتے تھے۔ اپنے گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا عمادی لکھنو آ گئے اور یہاں ایک عالم مولانا عبدالعلی آسی کی صحبت میں رہ کر عربی اور دیگر علوم حاصل کئے۔ مولانا آسی کے مطبع سے ایک عربی رسالہ ''البیان'' نکلتا تھا۔ یہیں مولانا عمادی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ''البیان'' کے تبادلے میں مصر اور ٹیونس کے اخبارات آتے تھے۔ ان اخبارات کے مطالعے سے مولانا عمادی

کی عربی میں مہارت اور بڑھی جو آگے چل کر ترجمے اور وضع اصطلاحات میں ان کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نعمانی نے الندوہ کی سب ایڈیٹری کا کام مولانا عمادی کے سپرد کیا۔ بعد ازاں امرتسر کے اخبار ''وکیل'' کی ادارت کا کام بھی مولانا عمادی نے سنبھالا۔ جب مولانا آزاد نے ''الہلال'' نکالا تو مولانا عمادی بھی اس اخبار سے وابستہ ہوگئے۔ جب مولانا ظفر علی خاں نے اخبار زمیندار لاہور سے جاری کیا تو مولانا عمادی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنی پوری صحافتی زندگی میں مولانا نے کئی معرکے کے مضامین لکھے۔

اگست ۱۹۱۸ء میں مولانا ظفر علی خان کی تحریک پر مولانا عمادی حیدرآباد آئے اور یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمے میں ان کا تقرر بحیثیت مترجم عمل میں آیا۔ وضع اصطلاحات کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ تاریخ طبری (دو جلدوں) طبقات ابن سعد (بارہ جلدوں) اور تاریخ یعقوبی کے ترجمے انہوں نے کئے۔ دائرۃ المعارف اور کتب خانۂ آصفیہ جیسے علمی مراکز کے وہ مشیر تھے۔ دارالترجمے میں ہونے والے تراجم کو بحیثیت ناظر مذہبی دیکھنا بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھا کہ کہیں ترجمے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ آجائے جو کسی عقیدے یا مسلک کے لوگوں کی دل شکنی کا باعث ہو۔ مولانا عمادی ۱۹۴۰ء تک برسرِ خدمت رہے۔ ۱۹۴۰ء میں آصفِ سابع نے ان کی مدتِ ملازمت میں پانچ سال کا اضافہ کرتے ہوئے۔ تنخواہ کا نصف بطور پنشن منظور فرمایا۔

مولانا عبداللہ عمادی نہایت خلیق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ وہ اپنے سے کم تر درجہ کے لوگوں سے بھی اس درجہ انکسار سے پیش آتے تھے کہ بسا اوقات بعض سادہ لوح حضرات خود کو مولانا کے برابر کا سمجھنے لگتے تھے۔ مولانا کے تبحر علمی کا ہر شخص معترف تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے عالمِ دین نے ان کی وفات پر ایک تفصیلی مضمون لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے جو بہت کم کسی کو گردانتے تھے، مولانا کے فیضانِ صحبت کا جی کھول کر اعتراف کیا ہے۔ مولانا عبداللہ عمادی اپنی تنخواہ میں ایک مدخیرات اور حسن سلوک کی رکھتے تھے۔ جس سے ان کی شرافتِ نفس کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے گھر آنے والوں کی مدارات کرتے تھے اور جب بھی اپنے وطن جاتے تو عزیز و اقارب کے لئے تحفے تحائف لے جاتے۔

مولانا عمادی نے شوال ۱۳۶۶ ہجری مطابق ستمبر ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد میں بعمر ۷۰ سال رحلت فرمائی۔ (تلخیص بہ حوالہ یادرفتگان، مولانا سلیمان ندوی مطبوعہ ۱۹۸۶ء)

○○○○

خط کا عکس

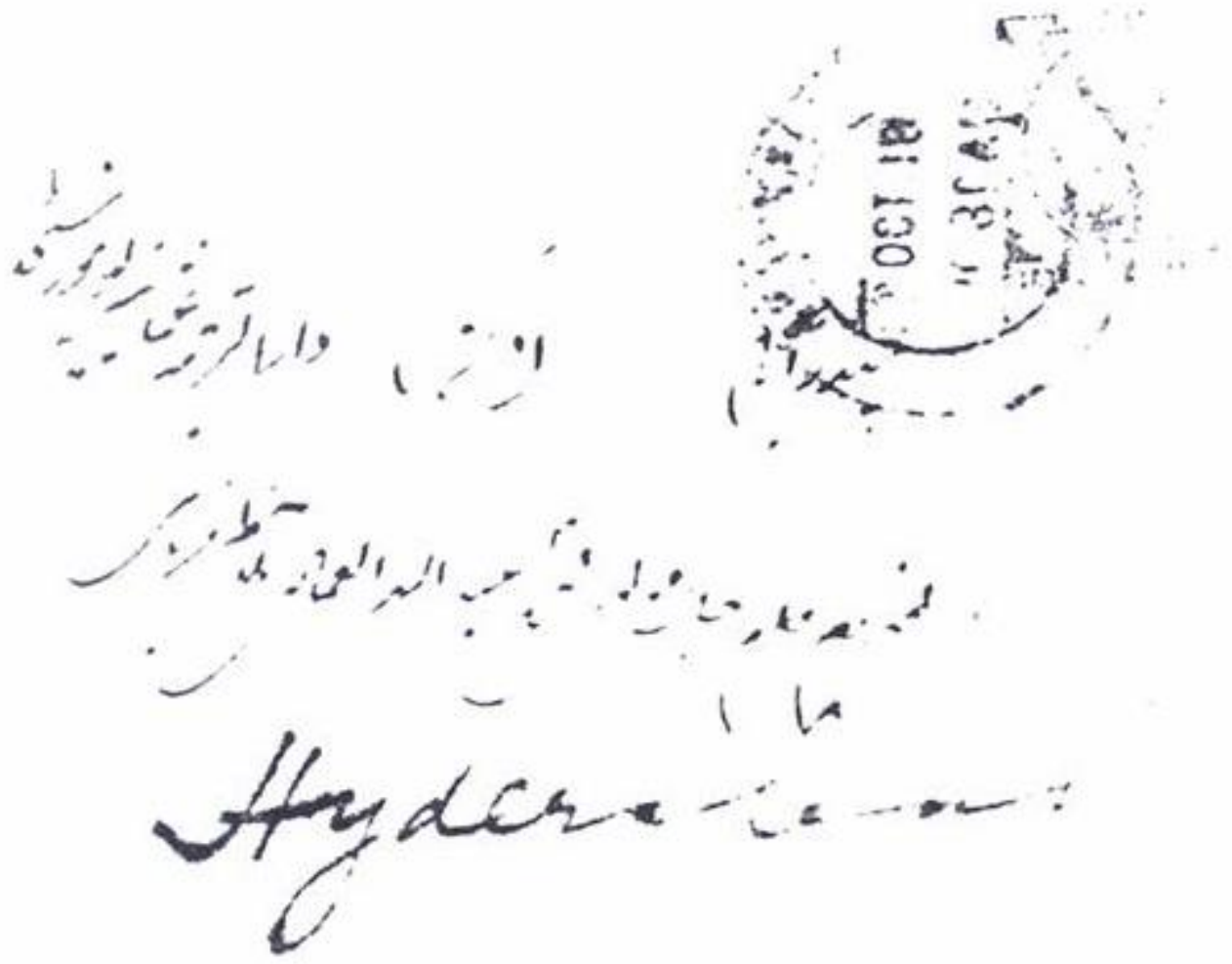

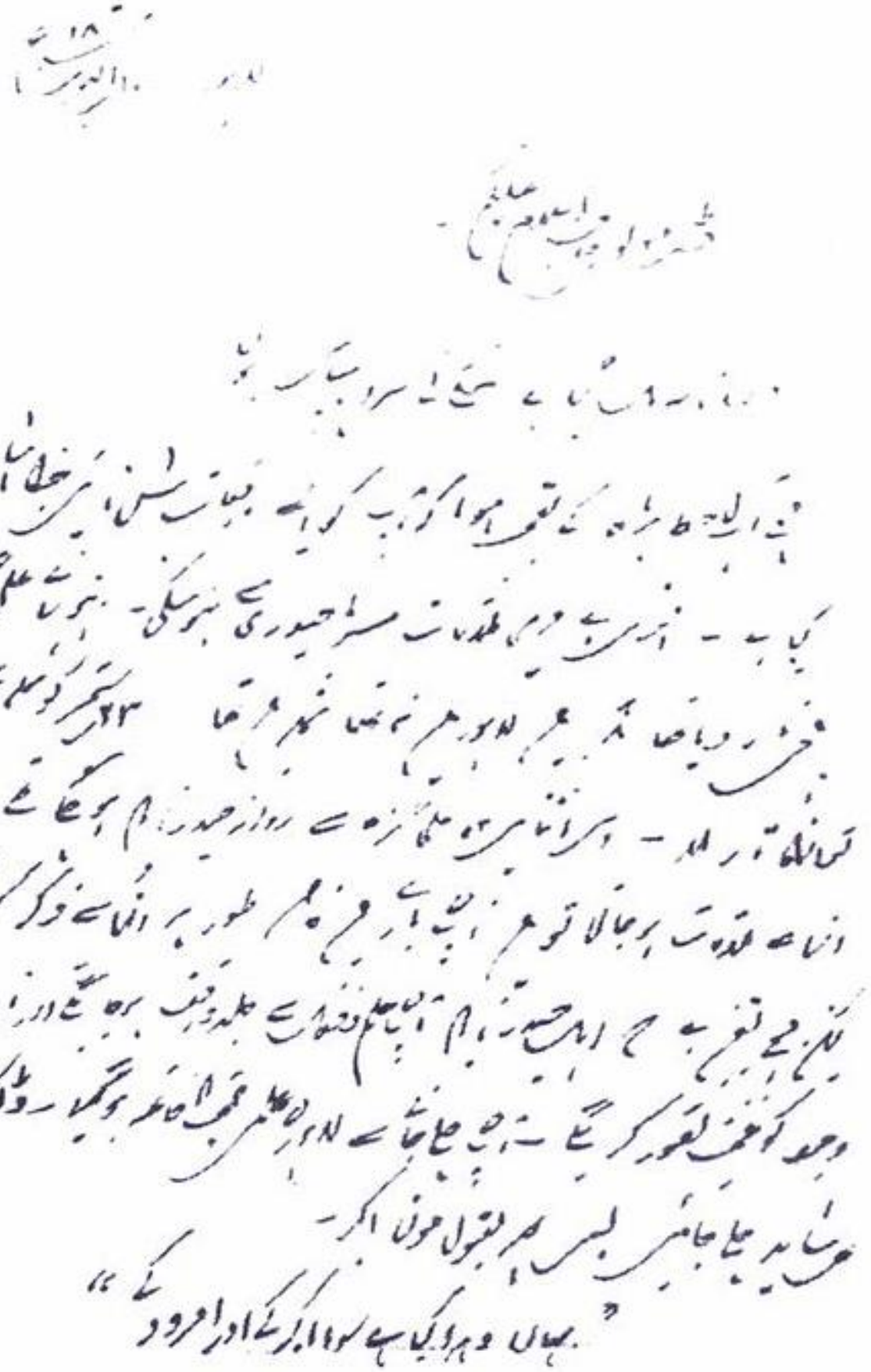

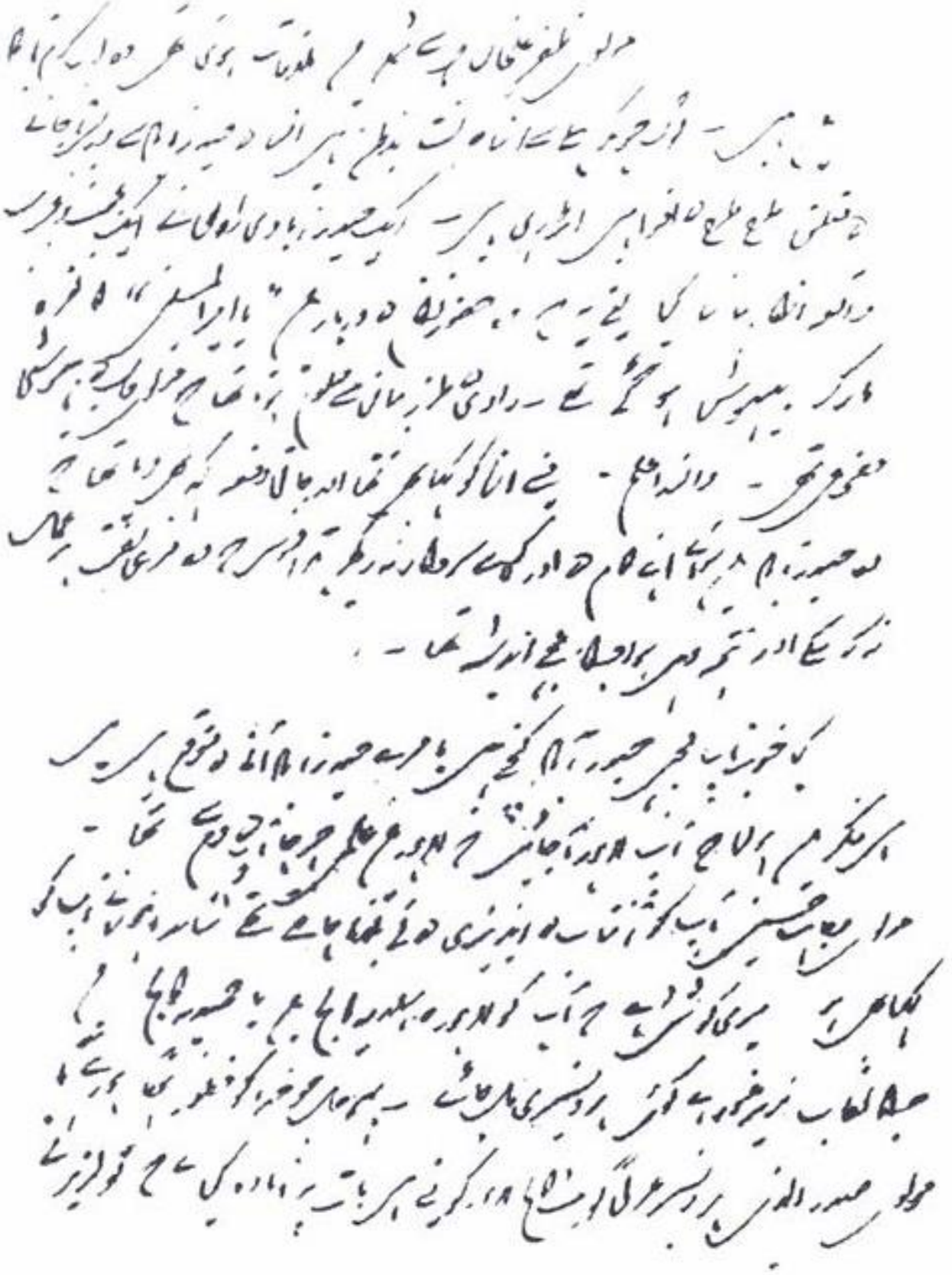

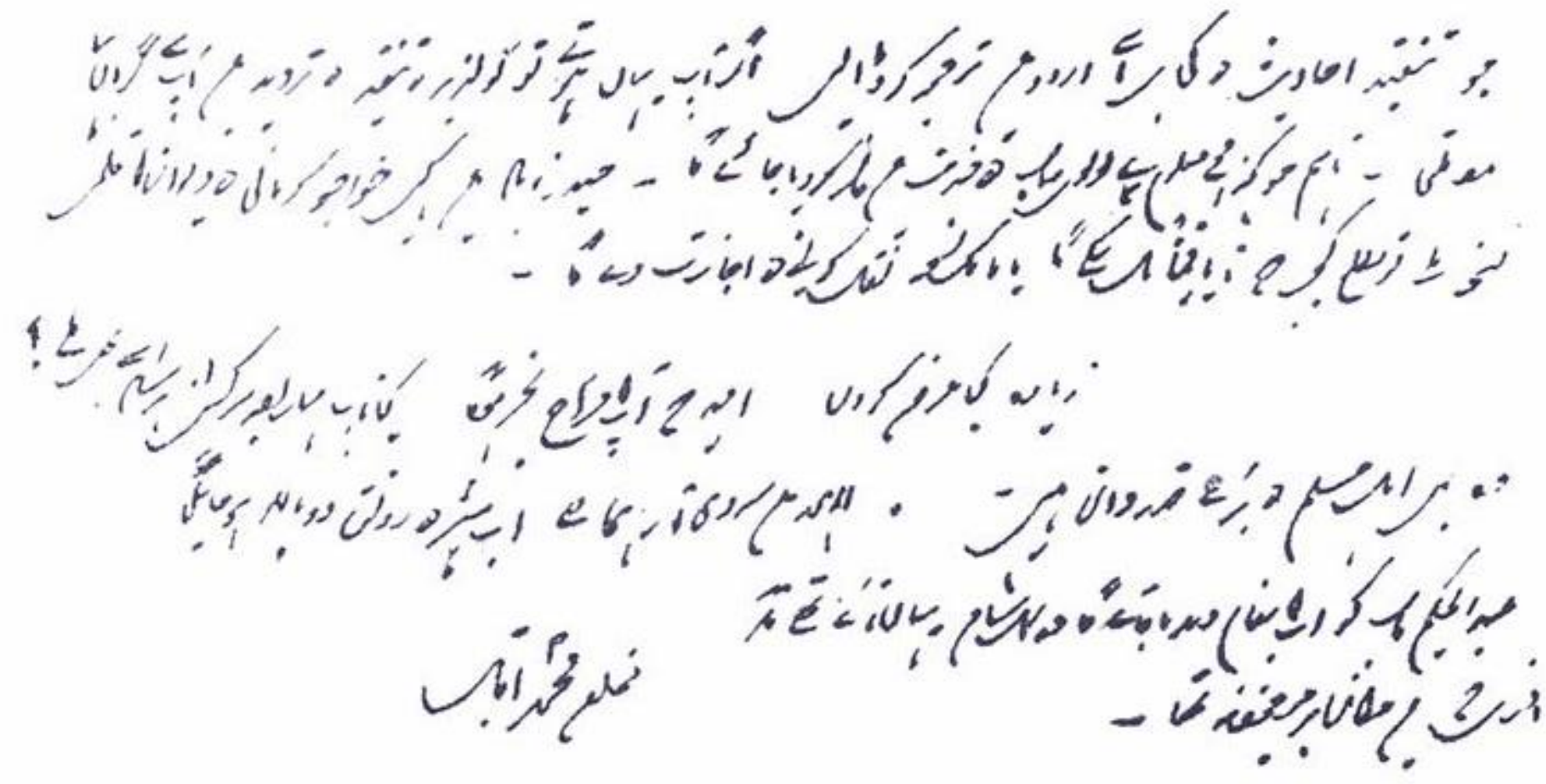

(مولانا عبداللہ عمادی کے نام مکتوب کا متن)

لاہور۔۱۰/۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء

ڈیر مولوی صاحب، السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

مجھ کو آپ کا خط پڑھ کر تعجب ہوا کہ آپ کو ایسے واقعات پیش آئیں، جن کا اشارہ آپ نے کیا ہے۔ افسوس ہے میری ملاقات مسٹر حیدری سے نہ ہوسکی۔ انہوں نے علی گڑھ سے مجھے تار دیا تھا، مگر میں لاہور میں نہ تھا شملہ میں تھا۔ ۲۳ ستمبر کو شملہ سے آیا تو ان کا تار ملا۔ اس اثناء میں وہ علی گڑھ سے روانہ حیدرآباد ہو چکے تھے۔ اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو میں آپ کے بارمیں خاص طور پر ان سے ذکر کرتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اہلِ حیدرآباد آپ کے علم و فضل سے جلد واقف ہو جائینگے اور آپ کے وجود کو غنیمت تصور کریں گے۔ آپ کے چلے جانے سے لاہور کی علمی صحبت کا خاتمہ ہوگیا۔ ڈاکٹر اعظم الدین بھی شائد چلے جائیں، بس پھر بقول مولانا اکبر۔

''یہاں دھرا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے''

مولوی ظفر علی خاں صاحب سے شملہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ کرم آباد میں ہیں۔لوگ چونکہ پہلے سے ان کی نسبت بدظن ہیں ان کے حیدرآباد سے واپس آجانے کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ایک حیدرآبادی راوی نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا یعنی یہ کہ وہ حضور نظام کے دربار میں ''یا امیر المسلمین'' کا نعرہ مار کر بیہوش ہو گئے تھے۔راوی کے طرزِ بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب کی بیہوشی مصنوعی تھی۔ واللہ اعلم۔ میں نے ان کو کہا بھی تھا اور جاتے دفعہ کہہ بھی دیا تھا وہ حیدرآباد میں سوائے اپنے کام کے اور کسی سے سروکار نہ رکھیں، مگر افسوس کہ میری نصیحت پر عمل نہ کر سکے اور نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

کیا خوب آپ مجھے حیدرآباد کھینچتے ہیں یا میرے حیدرآباد آنے کے متوقع ہیں۔ میں اس فکر میں ہوں کہ آپ لاہور آجائیں کہ لاہور میں علمی چرچا آپ کے دم سے تھا۔مولوی وجاہت حسین آپ کو آفتاب کی ایڈیٹری کے لئے بلانا چاہتے تھے، شاید انہوں نے آپ کو لکھا بھی ہو۔ میری کوشش ہے کہ آپ کو لاہور کے اسلامیہ کالج میں یا حمیدیہ کالج میں جس کا نصاب زیرغور ہے کوئی پروفیسری مل جائے۔ بہرحال جو خدا کو منظور ہوگا ہو رہے گا۔مولوی صدرالدین پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور کو میں نے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ گولڑیرنے .....

جو تنقید احادیث کی ہے اسے اردو میں ترجمہ کر ڈالیں۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو گولڈزیر کی تنقید کی تردید میں آپ سے گراں بہا مدد ملتی۔ تاہم جو کچھ مجھے معلوم ہے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔ حیدر آباد میں کہیں خواجہ کرمانی کے دیوان کا قلمی نسخہ ملے تو مطلع کیجئے کہ آیا قیمتاً مل سکے گا یا مالک نسخہ نقل کر لینے کی اجازت دے گا۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ کیا آپ مہاراجہ سر کشن پرشاد سے بھی ملے؟ وہ بھی اہل علم کے بڑے قدرداں ہیں۔ لاہور میں سردی آ رہی ہے، اب شہر کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔

عبدالحکیم صاحب کو آپ کا پیام دے دیا جائے گا۔ وہ کل شام یہاں آئے تھے، مگر افسوس کہ میں مکان پر موجود نہ تھا۔

مخلص
محمد اقبال

سید امتیاز الدین

علاّمہ عمادی اور اقبال

اقبال کے بارے میں علامہ عمادی کے مضامین دستیاب نہیں ہیں، لیکن بعض تحریروں اور خطوط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان نہایت مخلصانہ روابط تھے اور ایک دوسرے کے قدرداں تھے۔

جب اقبال کی مثنوی اسرار خودی شائع ہوئی تھی تو اس پر تنقیدوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مخالفین میں خواجہ حسن نظامی اور کئی اصحاب شامل تھے۔ اس وقت مولانا عمادی نے اقبال کے نقطۂ نظر کی تائید کی اور مضامین لکھے جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام ایک خط مورخہ ۳ر ستمبر ۱۹۱۶ء میں اقبال نے علامہ عمادی کی طرز تحریر اور لیاقت علمی کی ستائش کی۔ اقبال کے خط کا متن درج ذیل ہے۔

''ایک عریضہ اس سے پیشتر ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ آج پھر عریضہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

''مجھے یاد ہے سرکار نے یا مجھے لکھا تھا یا زبانی ارشاد فرمایا تھا کہ ایک قابل آدمی کی ضرورت ہے جو سرکار کے مشاغل تصنیف و تالیف میں مدد و معاون ہو۔ میں تلاش میں تھا۔ آخر ایک آدمی مل گیا ہے یعنی مولانا عبداللہ العمادی۔ جونپور کے رہنے والے ہیں، لاہور میں ایک عرصے سے مقیم ہیں، عربی و فارسی میں ان کی لیاقت اعلیٰ درجے کی ہے اور اردو نثر نویسی میں ان کا طرز تحریر جدت رکھتا ہے، علوم اسلامیہ میں ان کی مہارت کامل ہے اور ان کی پرائیویٹ زندگی بالکل بے داغ ہے۔ پنجاب کے بعض اخباروں کی ایڈیٹری بھی کر چکے ہیں، مثلاً وکیل، زمیندار و لمعات وغیرہ۔ غرض کہ نہایت قابل آدمی ہیں۔ میرے خیال میں ان سے بہتر آدمی سرکار کو نہ مل سکے گا۔ تنخواہ ان کو ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار ملتی رہی ہے۔ اگر سرکار کو ضرورت ہو اور ان کو پسند فرمائیں تو

تنخواہ کے متعلق گفتگو کرلوں گا۔ زیادہ کیا عرض کروں، اس خط کا مقصد صرف یہی اطلاع تھی جو اوپر عرض کر چکا ہوں۔'' (بہ حوالہ اقبال بنام شاد)

۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن سے مولوی محمد عبدالرزاق راشد ایچ سی ایس نے کلام اقبال کو یکجا کر کے پہلی مرتبہ کلیات اقبال شائع کی تھی۔ جس پر مولوی عمادی کی تقریظ سے اقبال کے بارے میں ان کے اعلیٰ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

''اقبال کا دل وحی الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ کشف غطاء نے اس کے سامنے سے آسمان و زمین کے پردے اٹھادے ہیں اور اس کو صاف نظر آرہا ہے کہ ۵۷۰ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظامی نے ''مخزن اسرار'' میں جو فریاد کی تھی، اس چودھویں صدی میں وہ دعا مستجاب ہونے کو ہے۔ توحید کی عنقریب آنے والی عظمت کا نظارہ اس کے روبرو ہے۔ اور وہ:

محوِ حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

ہر ایک اسلامی زبان کی شاعری میں یہ خصوصیت اقبال ہی کے لیے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں یہی ایک حسّان الہند ہے، جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لے کر پیرینیز (Pyrenees) کی چوٹیوں تک اعلائے لوائے نبویؐ کے لیے قوم کو آمادہ کر رہا ہے۔'' (۲۸ر جون ۱۹۲۴ء)

علامہ اقبال نے مولانا عمادی کو لکھا کہ:

''اکبر الہ آبادی نے تو یہ لکھا ہے:

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

لیکن یہاں لاہور میں نہ تو اکبر ہیں نہ امرود۔ ایک اقبال ہے، وہ بھی برائے نام!''

مولانا نے جواب میں نہایت برجستہ لکھا:

تجھ پر اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالامال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحورِ تہذیب فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے

اقبال کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر ان کے مشہور فارسی قطعہ کا اسی وقت قلم برداشتہ علامہ

عمادی نے ترجمہ فرمادیا۔

اقبال

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

علامہ عمادی

سرور دل نواز آئے نہ آئے
پھر اب بوئے حجاز آئے نہ آئے
زمانہ اس گدا کا ہوگیا ختم
کوئی دنائے راز آئے نہ آئے

(ماخذات: (۱) اقبال بہ نام شاد ۱۷۴ (۲) کلیاتِ اقبال مرتبہ عبدالرزاق راشد مطبوعہ ۱۹۲۴ء (۳) یادداشت، مرتبہ محمد نورالدین خان، مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۳ء سلسلہ مطبوعات ادبستان دکن)

○○○○

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد

(ماخوذ از ''حیدرآباد کے ادیب'' مرتبہ پروفیسر زینت ساجدہ)

اکبر اور امرود والا الہ آباد آبائی وطن ہے لیکن حیدرآباد سے انہیں نسبت ازلی ہے۔ یہیں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم وتربیت ہوئی اور اسی سرزمین کے ہورہے۔ ان کا دل، ان کی طبیعت اور ان کی خوخصلت ٹھیٹ دکھنی ہے، البتہ لب ولہجہ وہی اترو والوں کا سا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی، سوپشتیں بھی حیدرآباد میں گذرتیں تب بھی ان کا لہجہ وہی رہتا۔ اس لئے کہ جو شخص انگریزی انگریزوں کے اور فارسی ایرانیوں کے لہجے میں بولتا ہے وہ اردو دکھنی لہجہ میں بول ہی نہیں سکتا۔

ظفر صاحب کی ابتدائی تعلیم رزیڈنسی اسکول اور چادرگھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی، بی اے کا امتحان نظام کالج سے کامیاب کیا۔ اور مدراس یونیورسٹی سے انگریزی میں اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز سٹی کالج سے ہوا جہاں پہلے اردو اور فارسی اور بعد میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ چادرگھاٹ کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے سے پہلے محبوب کالج سکندرآباد کے پرنسپل ہوگئے تھے۔ بعد میں اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہے۔

ظفر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شعرگوئی سے ہوا لیکن بعد میں نثرنگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایک مخصوص رنگ پیدا کیا۔ ان کی دو کتابیں ''تمدن عتیق'' اور ''متاع اقبال'' شائع ہوچکی ہیں۔ تمدن عتیق پروفیسر عطاء الرحمٰن کے اشتراک کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ (ان کی گرانقدر تصنیف ''آہنگ شعر'' عروض اور فن شعر پر بہت اہم ہے۔)

وہ بہت کم لکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اسے شائع کرانے کے بجائے سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ قطع نظر مضامین اور مختصر ڈراموں کے ان کی تین مستقل تصانیف کے مسودے برسوں سے دھرے ہیں، جن میں آہنگ شعر بہت اہم ہے۔ یہ کتاب عروض اور بلاغت سے متعلق ہے جس کے مطالعہ سے انشاء کی ذہانت اور جدت پسندی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ظفر صاحب

انگریزی، ہندی اور فارسی عروض پر ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں، اس لئے ان تینوں کا تقابلی مطالعہ اتنے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو موضوع کی ثقالت اور فنی موشگافیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔

انگریزی ادیبوں میں اسکر وائلڈ کے وہ شیدائی ہیں، اس کی کئی چیزوں کو اردو میں منتقل کیا ہے جن میں ''شاہد کی تصویر'' قابل ذکر ہے، یہ پکچر آف ڈورین گرے کا ڈرامائی روپ ہے۔ اس ڈرامے کے بعض حصے رسائل میں چھپ چکے ہیں۔

ظفر صاحب کا طرز تحریر بڑا رنگین اور جاندار ہوتا ہے۔ وہ نثر میں، اس کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے، شعر کا حسن پیدا کر دیتے ہیں، اور ہندی الفاظ کچھ اس خوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ عبارت چمک اٹھتی ہے۔

(ماخوذ از حیدر آباد کے ادیب۔ مرتبہ پروفیسر زینت ساجدہ)

(پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد اپنی زندگی کے آخری ایام میں پاکستان منتقل ہو گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔)

تصانیف

۱۔ تمدن عتیق مطبوعہ ۱۹۳۶ء

۲۔ متاع اقبال مطبوعہ ۱۹۳۹ء

ایک سو صفحات پر مشتمل کتاب میں حسب ذیل تین مضامین شامل ہیں

(ا) اقبال کی شاعری اور اس کا پس منظر (مرقومہ ستمبر ۱۹۳۸ء)

(ب) اقبال کا ذہنی ارتقاء (مرقومہ اگست ۱۹۳۸ء)

(ج) اقبال کا شاعرانہ فلسفہ (مرقومہ مئی ۱۹۳۸ء)

۳۔ آہنگ شعر۔ مطبوعہ ۱۹۷۰ء

(فن شعر اور نظم و آہنگ پر ایک بلند پایہ تصنیف)

○○○○

خط کا عکس

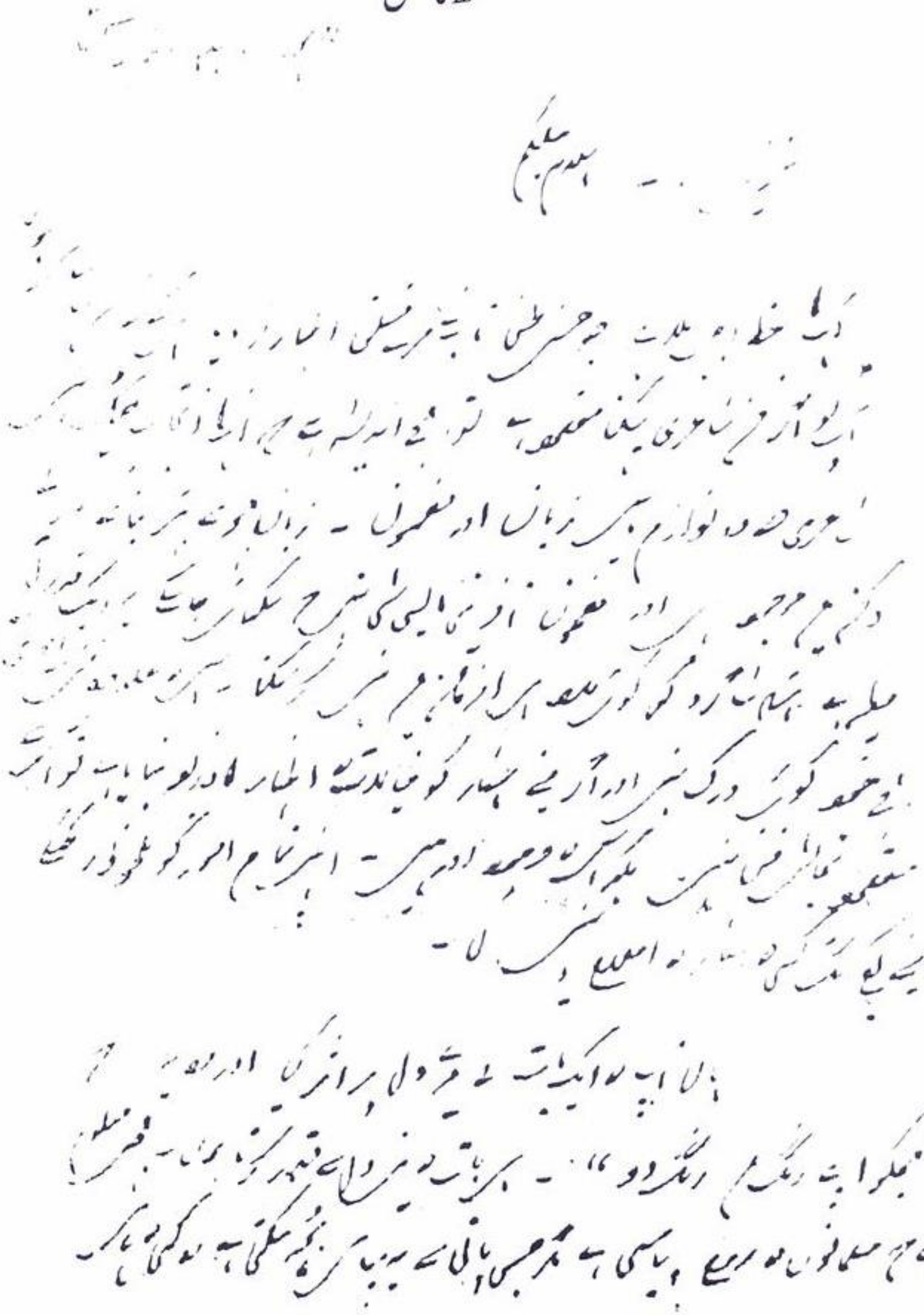

(پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کے نام مکتوب کا متن)

لاہور

۳۱/۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء

عزیز من

السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ جو حسن ظن آپ نے میرے متعلق اظہار فرمایا، اس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں آپ کو اگر فن شاعری سیکھنا مقصود ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا انتخاب ٹھیک نہیں۔ شاعری کے دولوازم ہیں زبان اور مضمون۔ زبان مجھ سے بہتر جاننے والے دکن میں موجود ہیں اور مضمون آفرینی ایسی شئی نہیں کہ سکھائی جاسکے۔ یہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔ استاد شاگرد کی کوئی مدد اس امرِ خاص میں نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ فن شاعری میں مجھے کوئی درک نہیں اور اگر میں نے اشعار کو خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے تو اس سے مقصود نمائش فن نہیں، بلکہ اس کے وجوہ اور ہیں۔ انہیں تمام امور کوملحوظ رکھ کے میں نے آج تک کسی کے اشعار کی اصلاح نہیں کی۔

ہاں آپ کی ایک بات نے میرے دل پر اثر کیا اور وہ یہ کہ ''مجکو اپنے رنگ میں رنگ دو'' اس بات کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمانوں کی روح پیاسی ہے، مگر جس پانی سے یہ پیاس بجھ سکتی ہے وہ کسی کے پاس

نہیں ۔ زمانے کا رنگ اور ہوتا جاتا ہے ،اور اسلام کسی اور شئی کا مقتضی ہے لوگ کہتے ہیں صاحب اثر اب کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ موجودہ سوسائٹی کی آب وہ ہوا میں ان کا پیدا ہونا ایک تعجب خیز امر ہوتا۔ ہر پودے کے اگنے اور بڑھنے کے لئے مناسب زمین اور آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ وسطِ ایشیا کی سرزمین سے بخاری اور (۱) اب پیدا کیوں نہیں ہوتے؟ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ اب وہاں کی اخلاقی فضا اس قسم کی شخصیتوں کی نشوونما کے مخالف ہے بہر حال رنگ صرف خدا کا ہے ''ومن احسن من اللہ صبغۃ'' میں مسلمانوں اور ان کے نبیؐ کی محبت دل میں رکھتا ہوں اور اس کو سرمایۂ نجات جانتا ہوں۔ یہی محبت کبھی کبھی اشعار کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور بیدرد لوگ ان اشعار کو عروض اور قافیہ کے معیار پر پرکھتے ہیں۔یہ چیز آپ کے سامنے حاضر ہے، لیکن اس سے متاثر ہونے کے لئے صحبت کی ضرورت ہے، تاہم خطوط کے ذریعہ جو کچھ میں آپ کے لئے کرسکتا ہوں اس کے لئے حاضر ہوں۔ آپ کبھی کبھی خط لکھا کریں، جواب دینے میں انشاء اللہ کبھی دریغ نہ ہوگا۔ لیکن اگر اشعار کی اصلاح مقصود ہے تو آپ کو مشورہ دوں گا آپ جناب جلیل سے رجوع کریں۔زیادہ کیا۔عرض کروں امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال۔لاہور

---

(۱)اصل خط میں ایک اور نام اقبال نے لکھا ہے جو واضح نہیں ہے۔

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد

اقبال کا شاعرانہ فلسفہ

(یہ مضمون مئی ۱۹۳۸ء میں یعنی اقبال کے انتقال کے ایک ماہ بعد لکھا گیا۔ ادارہ)

اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا۔ اسی میں اس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ فلسفے اور شعر کا جہاں خوشگوار امتزاج ہو، شعر جادو بن جاتا ہے۔ اقبال سے پہلے یہ سعادت مرزا غالب کو نصیب تھی، جو اپنی اس انوکھی شانِ کج کلاہی کی بدولت اپنے ہمعصروں میں ممتاز رہے۔ غالب کی شعریت فلسفے پر سدا غالب رہی۔ لیکن اقبال کی فلسفیت بعض اوقات شعریت پر غالب ہو جاتی ہے، اور بہ حیثیت شاعر یہی اس کی کمزوری ہے۔ جب تک وہ (اقبال) اپنی انوکھی مذہبیت اور ''ہمہ اسلامیت'' کا دل دادہ نہ ہوا تھا، اس کا کلام مقبول خاص و عام رہا۔

گو ابتداء میں اقبال نے داغؔ سے رشتۂ شاگردی جوڑا تھا لیکن ذہنی اور روحانی حیثیت سے وہ غالبؔ کا پرستار اور غالبؔ کے کلام کا خوشہ چین تھا۔ غالبؔ کا اثر (چند غزلوں کو چھوڑ کر جو داغ کے رنگ میں ہیں) اس کی ابتدائی کوششوں میں صاف جھلکتا ہے۔ میں شاعر کی ایک نظم کے کچھ اشعار پیش کروں گا جو کسی خاص مصلحت کی بناء پر ''بانگ درا'' میں شامل نہیں کی گئی۔ نظم کا عنوان ہے نالۂ یتیم جو ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ الفاظ، بندشیں، ترکیبیں، اضافتیں، سب پر غالب کا اور خصوصاً غالب کے کلام کا ابتدائی رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

آمدِ بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم — ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم
لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبح دم — یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کی زیر و بم
رنگ کچھ شہرِ خموشاں پر جما سکتی نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

اسی نظم کا آخری بند، سلاستِ زبان اور خاطر نشین اندازِ بیان کا تنہا نمونہ ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ شاعر عجب نہیں کہ اپنے روحانی استاد کی طرح آگے چل کر سلاست اور نغمے کے دریا

بہادے۔ اس کے علاوہ اس نظم کے آخری بند کے اشعار اس امر کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ یہ کاشمیری الاصل برہمن زادہ، ممکن ہے کہ ہندی قومیت اور ہمالہ کی عظمت کے ترانے اور نئے شوالے کی من موہنی فضا کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں ''حجازی لے'' کا دل دادہ نہ ہو جائے۔ یہ ہو کر رہا، اور اسی بناء پر بعض قوم پرست ہندیوں اور اردو ادب کے پرستاروں کو اقبال سے اس کے جیتے جی دُھری شکایتیں رہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے اپنا قدیم ہندی مسلک (ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا'') کیوں چھوڑ دیا؟ اور پھر یہ کہ اردو کو تج کر ایران کی جانب انتقال ذہنی کیوں کیا؟ دوسرا سوال میرے نزدیک خارج از بحث ہے۔ البتہ پہلا سوال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے اور اس کا اجمالی جواب اس مختصر باب کا موضوع بحث ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں تمام ہندوستان قومیت اور ہوم رول کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اسی زمانے اور اسی فضا میں اقبال نے اپنی شعری استعداد اور خداداد ذہانت کا پورے طور پر احساس کیا۔ کوئی شاعر اپنے ماحول اور گردو پیش کے واقعات سے الگ تھلگ اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ وہ اپنے آس پاس دیکھتا ہے، اسے اپنی سرشت کے حساس سانچے میں ڈھال کر ایک خوبصورت اور دل کش انداز میں بیان کرتا ہے۔ اقبال کا ہندی ترانہ میرا وطن وہی ہے۔ نیا شوالہ اور تصویر درد، انھیں تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ان نظموں کے بیشتر اشعار اس قدر زبان زدِ خاص و عام ہیں کہ ان کا یہاں دھرانا کوئی تک نہیں رکھتا۔ غرض کہ تمام ہندوستان اقبال کی والہانہ تان اور ترانے سے گونج اٹھا اور اہل ملک نے بلا امتیاز مذہب وملت، اس نوجوان قومی شاعر کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

اپنی شہرت کا سکہ بٹھا کر ۱۹۰۵ء میں اقبال نے دیارِ مغرب کا رخ کیا۔ اپنے تین سالہ قیام کے زمانے میں انہوں نے فارسی ادبیات، اسلامیات، فلسفے اور خصوصاً فلسفہ قدیم کا گہرا مطالعہ کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تمدن اور وضع معاشرت سے انھیں ایک بدظنی اور نفرت ہوگئی۔ چنانچہ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں جو اشعار اقبال نے اپنے دوست (سر) عبدالقادر کے رسالے کے لئے بھیجے تھے، ان سے شاعر کے بدلتے ہوئے رجحان کا پتہ لگتا ہے۔

جیسے جیسے اس تنفر میں اضافہ ہوتا گیا، وہ رسولِ عربیؐ کی سیدھی اور پرجوش تعلیم کے گرویدہ ہوتے گئے اور بہ حیثیت فلسفی انہوں نے اسلام کے اصولوں کو نظر کے سامنے رکھ کر، عالم گیر اخوت اور حیات افراد کی ترقی اور تعمیر کا وہ انوکھا بیرنگ تیار کیا جس کو نہ تو نطشے اور نہ برگساں کے فلسفے

سے براہ راست کوئی تعلق ہے، جیسا کہ اقبال کے بعض یورپی ناقدوں نے دھڑلے کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو خود اقبال نے اپنے ایک خط کے ذریعہ (جو ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھا گیا تھا) دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ علاوہ اس خط کے شاعر کی فارسی اور اردو تصانیف میں بھی جا بجا فلاسفہ مغرب کی تعلیمات سے بیزاری اور کم اعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار جو ''ضرب کلیم'' سے لئے گئے ہیں

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا گہر صدف سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی — کس طرح خودی ہو لازمانی
شعلہ ہے ترے جنون کا بے سوز — سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری

ایک نظم (علم و عشق) کے دو بند اور دیکھیئے

علم نے مجھ سے کہا — عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا — علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن — کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب!
عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات
علم مقامِ صفات ، عشق تمنائے ذات
عشق سکون وثبات ، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب !

بہر حال کچھ اس قسم کے خیالات اور احساسات لے کر ۱۹۰۸ء میں اقبال ہندوستان آئے۔ اہل ملک کی آس بندھی کہ اقبال کے منہ سے وہی اگلی تان (ہندوستان ہمارا) نکلے گی۔ لیکن یہاں مضمون ہی کچھ اور تھا۔ بہتوں کو مایوسی ہوئی۔ لیکن اقبال نے پروانہ کی اور کچھ دنوں ''سارا جہاں ہمارا'' اور شکوہ وغیرہ سنا کر فارسی زبان میں اپنا انوکھا دستور العمل مرتب کرنا شروع کیا۔ یہ ایک شاعرانہ خواب تھا جو اسرار خودی اور رموز بے خودی کے اوراق میں ''مستور بھی عریاں بھی ہے۔''

یہ دونوں مثنویاں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان شائع ہوئیں لیکن اردو سے شاعر نے ابھی پورے طور پر عدم تعاون نہیں کیا تھا۔ اور اسکے انوکھے شاعرانہ فلسفیانہ دستور العمل کے شائع ہونے سے کچھ پہلے اور بعد تک بھی چند اردو نظمیں چھپتی رہیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ میں جنگ بلقان کے تاثرات اور عالم اسلام کے اضطراب اور بے چینی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔ یہ نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کم از کم مسلمانوں نے ''ہندی ترانے'' سے زیادہ ان نظموں کو سراہا۔ موخر الذکر نظم میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کی جھلک بھی بعض مقامات پر صاف نظر آتی ہے:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

.....

پاک ہے گرد وطن سے سرداماں تیرا — تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا — غیر یک بانگ درا، کچھ نہیں ساماں تیرا

''پاک ہے گردِ وطن سے سرداماں تیرا'' کا نعرہ ایک ایسا دھکا تھا جس کے بعد قوم پرستوں کو اقبال کی جانب سے مایوسی ہوگئی اور گو بہ حیثیت شاعر، اقبال کی عظمت کے اس کٹر مخالفین بھی معترف رہے۔ تاہم اقبال کی ہمہ اسلامی (پان اسلامی) تحریک ایک مجذوب کی بڑ سمجھی جانے لگی مگر شاعر اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے آخر کار اپنا منظور دستور العمل (جس کی شیرازہ بندی میں اس کا شاعرانہ دماغ کئی سال سے مصروف تھا) اہل ملک اور ہندوستان کے باہر رہنے والے مسلمانوں کی رہنمائی اور ہدایت کی خاطر پیش کر ہی دیا اور ''شمع و شاعر'' لکھنے کے بعد کئی سال تک اردو کا رخ نہیں کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ شمع و شاعر اقبال کا بہترین کارنامہ ہے جس میں فلسفے اور شاعری کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ اگر اس کا سارا اردو کلام تلف بھی ہو جائے تو اس کی عظمت کے منوانے کے لئے یہ ایک نظم کافی ہے۔ یہ نظم شاعر کی شاعرانہ سحر کاری، فلسفیانہ پرواز نظر، جوشِ عمل اور انوکھی رجائیت کا نچوڑ ہے۔ انتخاب میں وہ بات کہاں؟ پھر بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات — یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سی ہے — موج کو آزادیاں ساماں شیون ہوگئیں

.....

فرد قائم ربطِ ملت سے ہی تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

وائے ناکامی کہ تو محتاجِ ساقی ہوگیا
مئے بھی تو مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

کانپتا ہی دل ترا، اندیشہ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو، اے دہقان ذرا
دانہ بھی تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائیگی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نواسامانِ طیور
خونِ گل چیں سے کلی، رنگیں قبا ہو جائیگی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہی لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

برطانوی سامراج کے کارندے آخری دو بندوں کے اشعار کا پورے طور پر مطلب سمجھ لیتے تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتے!

شمع و شاعر اور اسرار و رموز کی اشاعت کے بعد چند ایک سال تک اقبال نے اور کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خاموشی بے سبب نہ تھی، اس لئے کہ جنگِ عظیم نے اقوام عالم کو بدحواس اور پریشان کرنے کے علاوہ، خود اقبال کے قصرِ اَمل کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اتحادیوں کے ہاتھ میں ٹرکی کی جان کے لالے پڑے تھے اور شاعر کا ہمہ اسلامی خواب یک لخت زائل ہوتا نظر آتا تھا۔ لیکن اقبال شاعر تھا، اور بہ حیثیت ایک شاعر کے اسے کسی نہ کسی طرح، اپنے شاعرانہ وجود سے اوروں کو محظوظ کرنا اور اپنے وجود کا ثبوت دینا لازم تھا۔ لہذا اس نے عالمگیر اخوت اور خلافت کی بجائے فلسفے اور تغزل میں پناہ لی۔ چنانچہ پیام مشرق اور دوسری فارسی تصانیف اسی گریز کا نتیجہ ہیں، جہاں شعر و نغمہ اور محض فلسفیانہ پرواز نظر کے سوا کوئی تعمیری، یا کام کا فلسفہ نظر نہیں آتا۔

جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد عالمی کساد بازاری، تجارتی پستی، اور بے روزگاری کے مسائل نے اہل بصیرت کو اشتراکی زاویہ نگاہ اختیار کرنے پر مجبور کیا یہی مسائل ہندوستان کے سامنے بھی تھے۔ مگر اقبال نے وطنی مسائل کی چوحدی سے گزر کر، سیاستِ عالم کے دوررس پہلوؤں اور اقوام مشرق کی زبوں حالی اور ابتری پر نظر دوڑائی ہے۔ اور پھر مغربی اقوام کی عیارانہ سیاست پر بے پناہ حملے کئے ہیں۔ ان تاثرات کی جھلک آپ کو اس نظم میں ملے گی جو غالباً ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کا عنوان ہے۔ ''خضرِ راہ'' پوری نظم پر تفکر اور اداسی کی ایک ہلکی سی چادر پڑی ہے۔ اور وہ اگلا سا جوش اور تعمیری جذبہ

کہیں نظر آتا۔ جہاں کہیں رجائیت بھی نظر آتی ہے، وہ دراصل اگلی تان کی صدائے بازگشت ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے غالباً ایک سال بعد مصطفٰے کمال نے ٹرکی کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفٰے کمال پر پڑنے لگیں۔ اقبال کے دل میں بھی امید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں اور طلوع اسلام کے عنوان سے ایک نظم شاعر نے پیش کی۔ یہاں اقبال کی تان میں پھر وہی اگلی سی تڑپ صاف طور پر نمایاں ہے۔ لیکن یہ خوشی دیر تک رہنے والی نہ تھی، اس لئے مصطفٰے کمال نے بعد میں جو کچھ کیا اس سے نہ صرف قبال، بلکہ تمام سادہ دل مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نظر کے کچھ اشعار یہاں پیش کرتا ہوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ کن توقعات سے اقبال نے مصطفٰے کمال کا خیر مقدم کیا تھا۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق پر آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

.....

لیکن اس امید کے زائل ہونے کے بعد سے اقبال نے پھر اس سرابِ رنگ و بو کی طرف رخ نہیں کیا اور نہ صرف اس میدان سے منہ موڑا، بلکہ ایک عرصے تک ''گیسوئے اُردو'' کی شانہ گری بھی چھوڑ دی اور مولانا، رومؒ کی دنیائے عشق میں پناہ لی، یا اپنی اس سدا بہار دنیا میں جس کے

لازوال نقوش ملٹن کی ''گم شدہ فردوس'' یا دانتے کے ''آسمانی طربیہ'' سے آنکھیں ملاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصے تک اقبال پر اپنی امیدوں کے خاک وخوں ہو جانے کا اثر ضرور ہوا ہوگا۔ مخالفوں کی جلی کٹی باتیں زخم پر نمک کا کام کرتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ میخانۂ ''لاتقنطوا'' کا یہ پرانا دردکش تادیر اثر نہ لے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی ''ہمہ اسلامیت'' ہمہ مجذوبیت کی مترادف قرار دی جائے اور اس کا دل نہ دکھے؟ جب اس کا تصور کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے بے اختیار وہ نقشہ کھنچ جاتا ہے جب کہ انگلستان کا برگزیدہ نابینا شاعر (جان ملٹن) اپنی پوتر تحریک کی شکست کے بعد اپنے امرت بھرے قلم سے وہ لازوال نقوش تیار کر رہا تھا جن میں جا بجا عبرانی رسولوں کے غضب کی شان دمکتی ہے۔ اقبال کے اس دور کے کلام میں بھی بعض مقامات پر وہی دل کش شانِ غضب ہے۔ جاوید نامے کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اس حصے سے ماخوذ ہیں جہاں شاعر ''فلک زہرہ'' پر خدایانِ کہن کو شاد ماں دیکھتا ہے، بعل بغلیں بجا رہا ہے کہ حق اور دین برحق کی کیسی خواری ہوئی اور کس طرح دنیا از سر نو بت پرستی اور حیلہ جوئی کی طرف عود کر رہی ہے۔ اس طنز آمیز تشبیہ اور کنائے کی آڑ میں اقبال دراصل اپنے مخالفین پر برہمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اشعار ہیں:

آدم ایں نیلی تتق رابر درید — آں سوئے گردوں خدائے راندید
جانش از محسوس می گردد قرار — بوکہ عہدِ رفتہ باز آید پدید
زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس — آنکہ مارا از لحد بیروں کشید

اے خدایان کہن وقت است وقت!

درنگر، آں حلقہ و حدت شکست! — آلِ ابراہیم بے ذوق الست!
صحبتش پاشیدہ، جامش ریز ریز — آنکہ بود از بادہ جبریل مست!
خونِ اُو سرد، از شکوہ دیریاں — لاجرم ، پیرحرم زنار بست!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

درجہاں باز آمد ایامِ طرب — دیں ہزیمت خوردہ، از ملک ونسب!
از چراغِ مصطفیؐ اندیشہ چیست؟ — زانکہ اُو را پف زند، صد بو لہب!
اہرمن را زندہ کرد افسونِ غرب — روزِ یزداں زرد رُو از بیمِ شب!

(نغمۂ بعل۔ جاوید نامہ)

جاوید نامہ واقعی جاوید نامہ ہے۔ لیکن اس لازوال کتاب کے شاعرانہ محاسن پر نقد وتبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کے سلسلے میں بشرطِ موقع اس پر تفصیلی تنقید کروں گا۔

بہر حال اقبال کا فلسفیانہ خواب ناکام ہوا۔ اور ناکام ہونا اس کی قسمت میں تھا۔ البتہ اس حد تک ان کی شاعرانہ پیش بینیاں صحیح اتریں کہ اسلامی ممالک میں بیداری اور حیاتِ نو کی برقی لہر دوڑ کر رہی۔ لیکن جس راستے پر اقبال مسلمانوں کو چلانا چاہتے تھے، وہ نہ ہوا۔ وہ، ایران اور ٹرکی کی بیداری کو خوف کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ اسلامی روایات سے ان دونوں ممالک کا کھلا انحراف ایک نہ ایک دن اسی تباہی کا باعث ہوگا جس میں یوروپ مبتلا ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کی بدلی ہوئی روش اقبال کے نزدیک وہی اندھی تقلید ہے جس پر تجدّد کا کبھی اطلاق نہیں ہوسکتا۔ وہی مصطفٰے کمال جو طلوع اسلام میں اقبال کا در پردہ ہیرو تھا اور جسے پیام مشرق میں بھی ایک جگہ سراہا گیا ہے، جاوید نامے میں موردِ طعن بن جاتا ہے:

مصطفٰے کو از تجدّد می سرود — گفت نقشِ کہنہ را باید ز دود
نو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات — گر ز افرنگ آیدش لات ومنات
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست
سینۂ اُو را دمے دیگر نہ بود — در ضمیرش عالمے دیگر نبود

(فلک قمر۔ جاوید نامہ)

لیکن ''بے خودی'' کی اس شکست سے ''خودی'' کی نوا دن پر دن تلخ ہوتی گئی۔ زبور عجم، جاوید نامہ، ضربِ کلیم اور پس چہ باید کرد..... اسی شکست کی آواز یا خودی کی صدائے بازگشت ہیں۔ یہ کوئی ضروری بات بھی نہیں کہ ایک شاعر کا خواب حرف بہ حرف صحیح اترے۔ شاعر کا کام ہے ایک نشانِ راہ بتانا اور چند نقوش کا پیش کرنا۔ خواب کا صورت پذیر ہونا، طریقہ عمل پر منحصر ہے، جو دوسروں کا کام ہے۔ اپنے معترضین کے جواب میں (جنہوں نے بعض اوقات غائبانہ اور بعض اوقات کھلم کھلا اعتراضوں کی بوچھاڑ شروع کی تھی) اقبال نے ایک جگہ جو کچھ لکھا ہے، اس کا بھی تقریباً یہی مطلب ہے، ''میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو 'پان اسلامزم' (ہمہ اسلامیت) کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے۔ مجھ کو 'پان اسلامسٹ' ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو 'مشن' اسلام کا اور ہماری قوم

کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے مٹ کر رہے گی۔ اور اسلامی روح آخر کار غالب آئیگی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے، اپنی نظموں کے ذریعے تمام قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلام میں تھی کہ باوجود دولت اور امارت کے وہ اس دارفانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔''

مندرجۂ بالا عبارت سے دو پہلوؤں پر اور بھی روشنی پڑتی ہے:

(۱) یہ کہ وہ ''پان اسلامسٹ' تھے ضرور گو بہ حیثیت شاعر، اس تحریک کے عملی پہلو سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ (۲) یہ کہ بہ حیثیت ایک مذہبی انسان اور دین دار مسلمان کے، وہ آخر دم تک اس امر کا ایقان رکھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن اسلام کا ستارہ طلوع ہو کر رہے گا، جیسا کہ ائمہ اور اکابرِ ملت نے بشارتیں دی ہیں۔ چنانچہ پان اسلامزم کی بظاہر شکست کے بعد بھی وہ اپنی زبردست رجائیت اور قوتِ ایمان کی بدولت، اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے ناامید نہ تھے۔ لیکن ہمیں یہاں پر واقعات سے بحث ہے نہ کہ توقعات سے۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے فلسفیانہ خواب کا طلسم ٹوٹنے کے بعد بھی، اس کی شاعری کا طلسم برقرار ہے۔ یہ ہے شاعرانہ ساحری اور یہی حقیقی اقبال ہے۔ وہ شاعر پیدا ہوا، شاعر رہا، شاعر مرا۔ مانا کہ وہ فلسفی بھی تھا، لیکن اس کے لئے ایک اکتسابی چیز تھی۔ فلسفے کی رو میں وہ مدتوں بہتا رہا، اس کی شاعری کی عظمت اور بناء بھی فلسفے ہی پر ہے تاہم فلسفہ علم ہے اور شاعری عشق۔ شاعری سے اسے عشق تھا، اور عشق اس کی شاعری ہے۔ یہی اس کا من بھاتا کھاجا تھی۔ اسی سے اس نے سکون پایا اور اسی کے ذریعے اس نے اوروں کو سکون بخشا۔

ہوسکتا ہے (بلکہ یقین کے ساتھ کہا جائیگا) کہ اسے اسلام اور رسول عربیؐ سے عشق تھا۔ لیکن آج کل کے بعض قومی رہنماؤں کی طرح عملی سیاسیات اور دھرم بکھیڑوں میں پھنس کر، پرچاری اور اچھوت بننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ عمر بھی اپنے قناعت کدے میں دھونی رمائے، قلندرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس رنگ کو مرتے دم تک نبا ہا۔

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

(ماخوذ از متاعِ اقبال)

OOOO

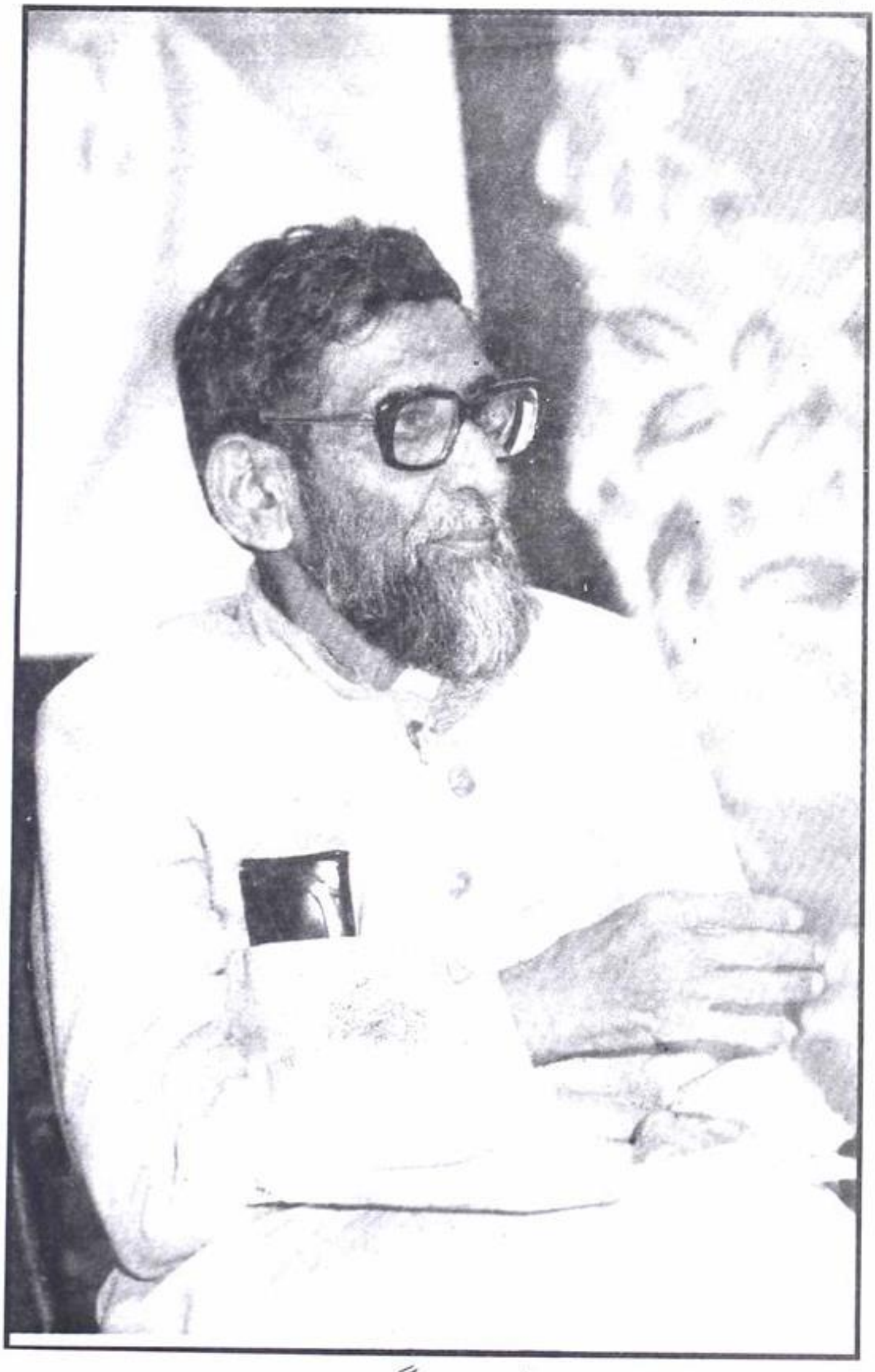

پروفیسر غلام دستگیر رشید

محمد ظہیر الدین

پروفیسر غلام دستگیر رشید

(تاریخ پیدائش: ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۸ء ، تاریخ وفات ۲۵/اپریل ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر رشید اور اقبالیات

علامہ اقبال سے ڈاکٹر رشید بے حد متاثر تھے۔ حیدرآباد میں اقبال شناسی کے فروغ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مطالعہ اقبال کے ضمن میں نئی نسل ان کی ممنونِ احسان ہے۔ خصوصاً سقوطِ حیدرآباد کے بعد ان کی تقاریر، اور درس اقبال نے نوجوانوں میں اقبال شناسی کا ذوق پیدا کیا۔ اقبالیاتی ادب کے ابتدائی دور ہی میں انہوں نے اقبال کے فکر وفن پر مشتمل تین کتابیں: آثارِ اقبال (۱۹۴۴ء)، حکمتِ اقبال (۱۹۴۵ء) اور فکر اقبال (۱۹۴۵ء) مرتب کیں۔ اقبالیات پر کئی اہم مضامین لکھے۔ جن میں اردو نثر کا اقبال (مضامین اقبال: مرتبہ تصدق حسین تاج کا مقدمہ)، اقبال حضور آدم میں، انسانِ کامل اور اقبال، اقبال کا پیام اقوام مشرق کے نام، وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ انہوں نے اقبال سے رموزِ بیخودی کے ترجمہ کی اجازت چاہی جس کے جواب میں اقبال نے ۲/مارچ ۱۹۳۵ء میں انہیں لکھا: ''رموزِ بیخودی کا ترجمہ انگریزی اگر آپ کرنا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ البتہ دو باتیں ضرور عرض کروں گا، ایک یہ کہ ترجمہ کی مشکلات اتنی ہیں کہ مترجم کا دل توڑنے کے لئے کافی ہیں، دوم یہ کہ میں خود ترجمہ کی اصلاح نہیں کرسکتا''۔ اقبال کے اس خط میں انگریزی ترجمہ کا ذکر ہے لیکن ڈاکٹر رشید نے اردو میں رموزِ بیخودی کا ترجمہ کیا تھا جو شائع نہیں ہوا۔ یہ مسودہ اور علامہ اقبال کا اصل مکتوب انہوں نے اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کو مرحمت فرمایا۔ ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال کے لکچرس منعقدہ ٹاون ہال باغ عامہ حیدرآباد میں وہ شریک رہے۔ نواب بہادر یار جنگ کی دیوڑھی پر منعقدہ ہونے والی درسِ اقبال کی محافل میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اقبالیات پر ان کی تقاریر سے استفادہ کرتی رہی۔ جاوید

نامہ پر ان کے درس کا اہتمام کیا گیا۔ چند لکچرس کے بعد ان کی علالت کی وجہ سے یہ سلسلہ ناتمام رہا۔ اقبالیات پر ان کی خدمات کے اعتراف میں اپریل ۱۹۸۵ء میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے ان کی خدمات میں پہلا اقبال ایوارڈ پیش کیا۔

شخصیت کی چند جھلکیاں

پروفیسر غلام دستگیر رشید کی رحلت کے بعد جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو ان کی شخصیت کی کئی جھلکیاں میرے چشم تصور میں ابھرنے لگتی ہیں۔ مسجد عامرہ ہو یا مسجد باغ عامہ یا کوئی اور محدود نشست کبھی وہ آیاتِ قرآنی کی دل نشین انداز میں تفسیر بیان کررہے ہیں، تو کبھی ہزاروں کے اجتماع میں سیرت طیبہ پر روح افروز تقریر کررہے ہیں۔ تقریر کا اسلوب ایسا کہ عالم اور عامی سب ہی کے قلوب میں ان کی بات اتر رہی ہے۔ کہیں کلام اقبال کے اسرار رموز کھول رہے ہیں، کہیں شاعر کی حیثیت سے رنگین اور شوخ کلام سناتے ہوئے محظوظ کررہے ہیں۔ کبھی کسی محفل میں ایک طالب علم کی طرح دوسروں کی تقریریں پوری توجہ اور انہماک سے سن رہے ہیں۔ سوالات بھی کررہے ہیں، کہیں حلقہ یاراں میں اپنی زندہ دلی اور مزاح سے محفل کو زعفران زار بنارہے ہیں۔ یہ جھلکیاں شنیدہ نہیں دیدہ کے درجہ میں آتی ہیں اور یہ یادیں کم کم ہی سہی تقریباً تیس سال سے زائد عرصہ پر محیط ہیں۔

گہری اور وسیع علمیت کے ساتھ وسعتِ نظر اور فکری توازن، حکمت اور نکتہ آفرینی، صوفیانہ ذوق، اور قلندرانہ مزاج، انکسار اور تواضع، بذلہ سنجی اور خوش مذاقی، طالب علموں کے ساتھ محبت اور شفقت، یہ ڈاکٹر رشید کے خاص اوصاف تھے۔

خود ان کی اپنی شخصیت کی نشوونما کا سفر اوروں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ اس کی مثال اب شاذونادر ہی ملتی ہیں۔ ان کے قریبی دیرینہ رفیق خواجہ حمید احمد صاحب کی روایت کے مطابق جب انہوں نے اپنے آبائی وطن نلگنڈہ سے حصول علم کے لئے حیدرآباد کا قصد کیا تھا تو مالی مشکلات کی وجہ سے تقریباً اسی میل کا سفر پیدل طئے کیا۔ ٹیوشن کے ذریعے اپنے اخراجات کی سبیل نکالی۔

ڈاکٹر رشید کی تاریخ پیدائش ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۸ء اور مقام پیدائش ضلع نلگنڈہ۔ وہ مولوی غلام محی الدین صاحب خزانہ دار کے فرزند تھے۔ حیدرآباد آنے کے بعد پہلے منشی کا امتحان دیا۔

انگریزی کا امتحان دے کر میٹرک کی سند حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ سے ایم اے تک عثمانیہ یونیورسٹی ان کے حصولِ علم کی آماجگاہ رہی۔ ۱۹۳۲ء میں جب انہوں نے ایم اے (فارسی) میں امتیازی کامیابی حاصل کی تو انگریزی ادبیات کے پروفیسر مسٹر اسپیٹ نے ان کی قابلیت اور لیاقت کے بارے میں یوں تبصرہ کیا تھا:

''وہ اعلیٰ تصورات اور غیر معمولی قوتِ اظہار کے حامل ہیں۔ ان کی گفتگو پُر اعتماد اور ان کا طرزِ استدلال پختہ کار اہلِ فکر کی یاد دلاتا ہے۔''

شعبہ اردو ناگپور یونیورسٹی سے بھی ایم اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ''فارسی میں نعتیہ شاعری کا ارتقاء'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی۔ تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ان کی آٹھ سالہ علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ پانچویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے طویل عرصہ پر محیط فارسی شاعری کے مطالعہ کا طلب گار تھا۔ سنائی، خاقانی، نظامی، عطار، رومی، خسرو، جامی، اقبال اور کئی شاعروں کے دواوین کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ نعتیہ شاعری پر مبنی کلام کا انتخاب، ان کی تشریح اور توضیح کے سلسلے میں ڈاکٹر رشید کی صلاحیت کا اندازہ خود ان کے استادِ محترم مولانا مناظر احسن گیلانی کی اس رائے سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس مقالہ کے بارے میں ریسرچ بورڈ میں دی تھی کہ ''شاعروں کی طویل فہرست میں کلام کا انتخاب شعر کی نزاکت اور معنویت کی پرکھ اور اس کے اظہار کا سلیقہ ضمناً ہی سہی خود فارسی شاعری جن تغیرات و انقلابات سے گزری ہے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت، فارسی شاعری اور ادب کے علاوہ اسلامی تصوف کے اسرار و حقائق کے مطالعہ کے بغیر وہ اس مقالہ کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔''

وہ طویل عرصہ تک نظام کالج میں فارسی کے استاد رہے۔ ۱۹۶۴ء میں بہ حیثیت صدر شعبہ فارسی وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔ اس کے بعد پروفیسر ایمریطس رہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے ان کی اعلیٰ خدمات پر اعزاز عطا کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدلقدیر حسرت، مولانا الیاس برنی سے وہ بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے ان بزرگوں سے فیض پایا اور شاگرد رشید رہے۔

تصانیف و تالیفات:

ترتیب، تالیف اور تصنیف کے میدان میں ان کے علمی کارنامے، اسلامیات، تصوف اقبالیات اور فارسی و اردو ادبیات پر محیط ہیں۔ اسلامیات کے ضمن میں ان کی اولین تالیفات میں

تعلیم القرآن شامل ہے۔ اس تالیف میں جناب عبدالرحمٰن سعید ان کے شریک رہے۔ اسلامی تہذیب کیا ہے، اسلام کے معاشی تصورات، اسلام کے سیاسی تصورات، اسلامی تقاریب وغیرہ جیسے موضوعات پر صفِ اول کے علماء اور اسکالرس کے بلند پایہ مضامین کو مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ مضامین ان کے حسن انتخاب کی دلیل ہیں۔ انہوں نے درجہ نہم کے لئے رسالہ دینیات کی بھی تالیف کی۔ اسلام کے معاشی فلسفہ اور نظریات سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی جس کا اندازہ اسلام کا معاشی فلسفہ، اسلامی اشتراکیت، اسلام کے معاشی رجحانات اور اشتراکی روایات وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھے گئے مقالات سے ہوتا ہے۔ انہوں نے مدارس یونیورسٹی میں توسیعی خطبات دیئے۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا خلاصہ **The Concept of Perfect Man in Persian Poetry** کے نام سے شائع کیا۔ جامعہ دارالعرفان کا نصاب مرتب کیا اور اس ادارہ کے صدر نشین رہے۔

تصوف میں کئی اہم مقالات کے علاوہ، ان کا اہم کارنامہ غزلیاتِ رومی پر تاریخی تنقید اور تبصرہ پر مبنی شمس معنوی، کی اشاعت ہے جو غالباً ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کتاب کی ستائش کرتے ہوئے لکھا کہ ''تحقیق و ترتیب مواد اور طرزِ استدلال و اظہار لائق داد ہیں'' اس کے علاوہ خسرو کے شاہکار دیوان ''غرۃ الکمال'' کو انہوں نے کئی ضروری توضیحات اور تشریحات کے ساتھ ایڈیٹ کیا۔

○○○○

اُردو خط کا عکس

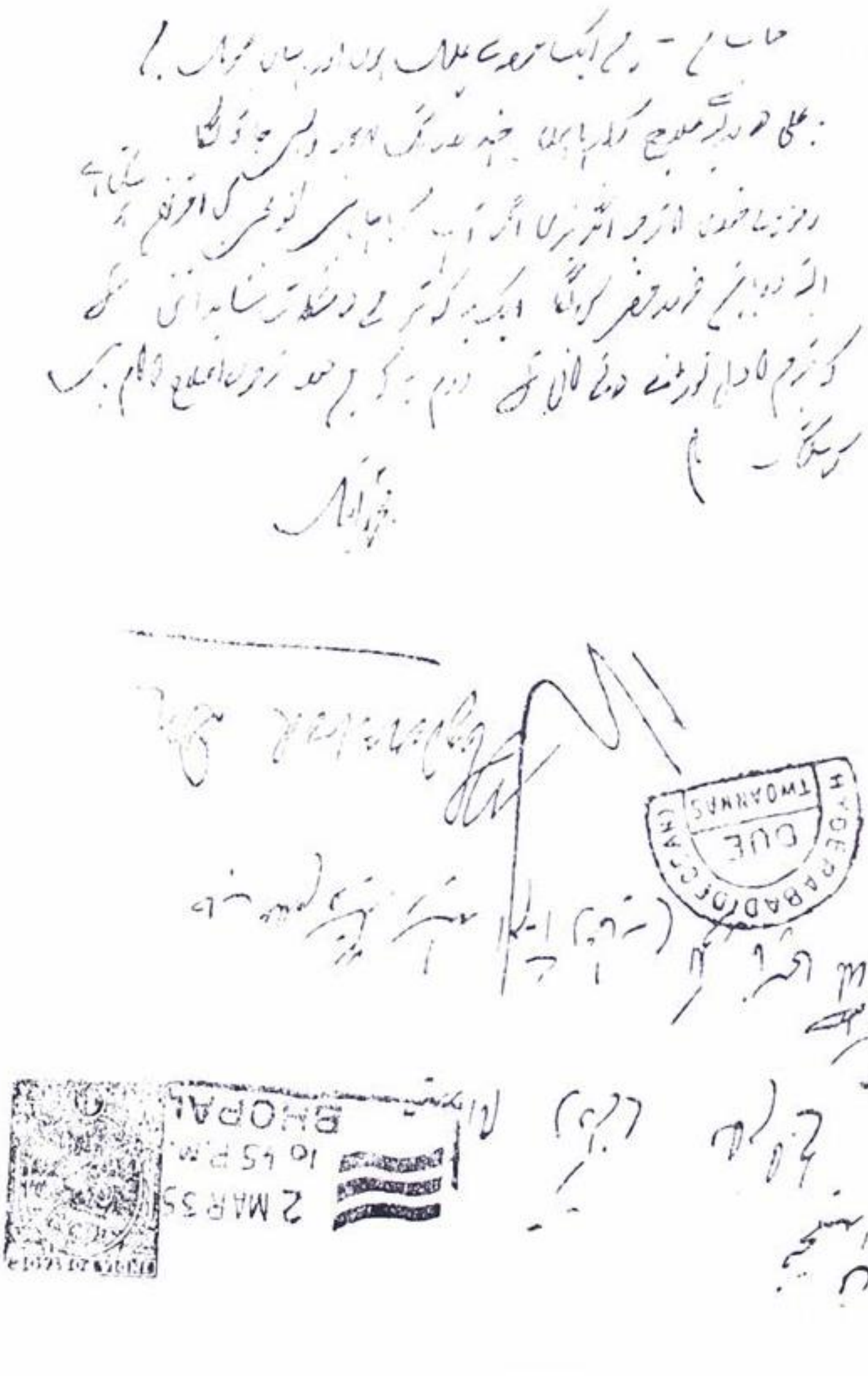

(پروفیسر غلام دستگیر رشید کے نام مکتوب کا متن)

بھوپال ۲/مارچ ۱۹۳۵ء

جناب من۔ میں ایک عرصہ سے علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں بجلی کے ذریعہ علاج کروارہا ہوں۔ چند روز تک لاہور واپس ہوجاؤنگا۔ رموز بے خودی کا ترجمہ انگریزی اگر آپ کرنا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ البتہ دو باتیں ضروری عرض کروں گا۔ ایک یہ کہ ترجمہ کی مشکلات شاید اتنی ہیں کہ مترجم کا دل توڑنے کے لئے کافی ہیں، دوم یہ کہ میں خود ترجمہ کی اصلاح کا کام نہیں کرسکتا۔

محمد اقبال

○○○○

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید

صبحِ مراد! اُردو نثر کا اقبال
انقلابی ادب کا معیار

(مضامین اقبال مرتبہ تصدیق حسین تاج، مطبوعہ ۱۹۴۳ء کا پیش لفظ)

خوشی بیا صبحِ مراد آوردہ
ہر شجر رانخلِ سینا کردہ (اقبالؒ)

حق مغفرت کرے ترجمان حقیقت اقبالؒ نے اپنے شعر کو ''ضرب کلیم'' بنا کر فکر کی تطہیر اور تعمیر کا سامان بہم پہنچایا۔ اس کا فیض روز افزوں ہے۔ ان کی ''نوائے پختہ'' کی صحبت انسانیت کے ساتھ ''گردشِ دیگرو ہم ایام را'' (میں زمانہ کو انقلاب بخشتا ہوں) کا وعدہ پورا کر رہی ہے۔

لیکن اس روشن ضمیر، مہر منیر نے اپنی منظوم تصانیف کے علاوہ نثر میں بھی ''عفتِ فکر'' اور گرمیٔ ذکر'' کا گرانقدر ورثہ چھوڑا ہے۔ یہ ہماری زندگی اور حریت کیلئے ''فروغِ صبح'' کا مصداق ہے کہ۔

زندگی از گرمیٔ ذکر است وبس حریت از عفتِ فکر است وبس

اب تک اقبالؒ کے انگریزی خطبات تو دو بار شائع ہو چکے ہیں لیکن اردو مضامین اور مقالات کو یکجا شائع کرنے کی سعادت پہلی بار جناب تصدق حسین صاحب تاج (مالک احمدیہ پریس) نے حاصل فرمائی ہے۔ انہیں ان مضامین کی فراہمی میں خاص ''ذوقِ جستجو'' سے کام لینا پڑا۔ کیونکہ یہ صحائف حکمت تقریباً مومن کی گمشدہ پونجی بن چکے تھے۔ یہ سعادت دراصل ''سعادتِ خِرد'' ہے۔ انہوں نے جب یہ اوراق میرے سپرد فرمائے تو میرے لئے ان کی زیارت طلوعِ صبح مراد تھی! دل نے بے اختیار خیر مقدم میں کہا۔

خوش بیا صبحِ مراد آوردہ

میں نے ایک سفر میں ان کا مطالعہ کیا۔ یہ سفر عالمِ معنیٰ کا سفر ثابت ہوا، یا یوں کہیے کہ آسمان حکمت پر سفر معراج تھا۔ گویا یہ اقبالؒ کا منثور جاوید نامہ ہے۔

انقلاب پرور اور ترقی پسند ادیب کا معیار اور مظاہرہ

یہ مرد خبیر اقبالؒ کی اردو نثر ہے۔ سچ پوچھئے تو اردو نثر کا اقبال ہے۔ ان دنوں انقلابی افکار کا بڑا زور ہے، ترقی پسند ادب کا بڑا شور ہے۔ مضامین اقبال اردو ادب کے عظیم الشان انقلابی مظاہر ہیں۔ یہ ترقی پسند ادب کا معیار ہیں۔ دلیل راہ ہیں۔ ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کا سنگِ بنیاد ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت اردو نثر میں انقلاب پرور، اور ترقی پسند حکیمانہ ادب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ یہ مضامین ہمیں احتساب کائنات کے حکیمانہ طریقے بھاتے ہیں، انسانی مسائل پر فکر و تدبر کے سلیقہ سے آشنا کراتے ہیں۔

ادب برائے زندگی

عہد آفریں اقبالؒ نے ہمارے حکما، شاعروں اور ادیبوں میں سب سے پہلے، ہر مذموم کو محمود بنانے والے ''آرٹ برائے آرٹ'' اور ''ادب برائے ادب'' کے نظریہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس تصور کو حکیمانہ دلائل اور عمرانی تجربات سے مدلل کیا۔ ان کی اولین تصنیف اسرار خودی اٹھائیے۔ حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیات پر ایک طویل عارفانہ نظم ہے۔ جن میں ان نظریات پر تنقید ہے۔ پھر اسلامی ادبیات پر ان کی تطبیق ہے۔ جاوید نامہ بھی اس نکتہ پر واضح بحث ہے۔ ''آرٹ برائے آرٹ'' کے اصول میں اقبال کے نزدیک حسن کا ایک ایسا تصور رہ جاتا ہے جس میں صداقت اس کے جزو لازم و لاینفک کے طور پر باقی نہیں رہتی۔ (حسن اُو را باصداقت کار نیست) ایسے آرٹ اور ادب سے خستہ جاں قوموں کی خستہ جانی اور ناتواں ملتوں کی ناتوانی روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

فکرِ صالح دَر ادب

اس لیے معیار ادب اقبالؒ کے نزدیک اُس کی حیات بخشی کی صلاحیت ہے۔ اور ادب اور آرٹ حیات انسانی کے تابع ہیں۔ وہ ادب میں فکرِ صالح کے طالب ہیں تاکہ آرٹ اور ادب پیکار حیات سے میل کھا سکیں اور اجتماعی تعمیر کے امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کریں۔ وسواس و ہراس کو دلوں سے دور کریں۔ کوہ گراں کو کاہ بنا دیں۔

اس مجموعہ میں دو مضامین اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ ایک جناب رسالتمآبؐ کا ادبی تبصرہ

دوسرا دیباچہ مرقع چغتائی ۔ انجمن ادبی کابل کی تقریر کا بھی یہی موضوع ہے۔ اقبالؒ نے ان مقالات میں یہ دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے وجدان نے کس طرح اس باب میں انسانی فکر وادب کی رہنمائی فرمائی ہے۔

اشتراکی اور ترقی پسند ادیب اس نکتہ کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ بڑے زور سے اقبال کی طرح ادب برائے زندگی کا پرچار کیا جارہا ہے۔ دونوں کا فرق خود زندگی کی بابت ان کے تصورات میں ملتا ہے۔ اشتراکی زندگی کو صرف مادی پیمانہ امروز وفردا سے ناپتے ہیں۔ دانائے راز اقبالؒ کا تصور حیات وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ ان کی نگاہ اور عقیدہ میں زندگی کے تسلسل، توسیع اور استحکام کے امکانات اور لوازم کا دائرہ حد بندی سے بالاتر ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی

میرا یہ یقین محکم ہے کہ ایک دن اشتراکی ادیب پیہم فکر وتجربہ کی بدولت اقبالؒ کی تیر بینی اور دور رسی کے قابل ہو جائیں گے۔ فکر ونظر کا یہ اتحاد اپنے وقت پر ارتقاء کی قدرتی منازل طے کر لیگا اور غلام آباد ہند اور مظلوم انسانیت کے لئے وہ ساعت سعید ہوگی۔

حضور اقبال میں

ان مضامین کو پڑھنا حضور اقبالؒ میں پہنچنا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائیگا آنکھیں کھلتی جائیں گی اور سر جھکتا جائے گا۔ ''شعر اقبال'' سے تو آپ بار بار ملتے ہیں۔ اب ''ڈاکٹر اقبال'' سے ملئے۔ ان کے دل ناصبور کی حرکت اور تڑپ دیکھ چکے ہیں۔ ان اوراق میں ان کے علم وہنر کا سرور محسوس فرمائیے۔ ان کے اشعار کا ''جمالِ دلبری'' بے نقاب ہو چکا ہے۔ یہاں ان کی حکمت کے ''جلالِ قاہری'' کا نظارہ کیجئے۔ ان اوراق میں ان کے عشق کا جنون عقل ذوفنون بن گیا ہے۔ ان کے شعر میں آہ صبحگاہ حامل حیات ہے تو نثر میں دوررس نگاہ پیامِ انقلاب ہے۔ ان کی صحبت خزف کو دُر بناتی تھی تو ان کی حکمت ''تہی'' کو ''پُر'' کر دیتی ہے۔ ان مضامین سے اقبالؒ کے بعض مبہم اور مشکل تصورات معین اور واضح ہو جاتے ہیں۔ بعض مجمل نکات مفصل توجیہات کے آئینہ میں اجاگر ہوتے ہیں۔

انقلاب افکار، ترقی پسند ادب

اُن کے احساسات کی طرح خودشناس اقبالؒ کے افکار، ان کے باطن کا ایک سیلِ بے پناہ ہیں۔ ان مضامین میں ایک بندۂ خدامست نے باطل کے ہر کہن بتخانہ کو شکست کا چیلنج دیا ہے۔

باطل اقدار کی جگہ ترقی پرور اقدار پیش کئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ذہن انسانی کو دگرگوں کر دیں تا کہ وہ جہانِ دیگر پیدا کر سکے۔ ان کے افکار سے بحر و بر میں انقلاب کا طوفان برپا کیا جا سکتا ہے۔ سامراج اور سرمایہ کے خلاف وہ مارکس وغیرہ کی نفی (ا ا) کی بے حد تحسین کرتے ہیں۔

اقبالؒ ادب و فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے نہایت بالغ نظر عالم اور ماہر ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے اصول اور قوانین پر ان کی دور رس نظر ہے۔ حکمت ایمانی اور مصلحت عمرانی کا مطالعہ ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں خوب کیا ہے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ رموز بیخودی ہے۔ اس مجموعہ کے اکثر ممتاز مضامین کا موضوع بحث یہی ایمانی حقیقتیں اور عمرانی حکمتیں ہیں۔ مثلاً ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، قومی زندگی، خطبۂ صدارت، جغرافی حدود اور قومیت وغیرہ ان کی منظوم تصانیف کی طرح خود ان کے اپنے الفاظ میں ان مضامین کی غایت بھی

''ان اخلاقی، مذہبی، ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ تا کہ افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو۔ ان کے نزدیک انسانی تربیت و رہنمائی کی تاریخ میں ہی مقام محمدیؐ ہے۔

''نبوتِ محمدیہ کی غایت انعایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیت قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو ان تمام آلودگیوں سے پاک کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیجاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے یہ ہے مقام محمدیؐ یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔ (مضامین اقبال ص ۱۹۲)

سمجھا جاتا ہے کہ اقبال کی اسلام کے ساتھ گرویدگی گروہ بندی یا فرقہ پسندی کے مذاق پر مبنی ہے حالانکہ صورت حال برعکس ہے۔ یہ خیال لاعلمی یا نارسائی کے باعث ہے اس کا سبب بزبانِ اقبال سنیئے۔

اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوام انسانی امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں

کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا (مضامین اقبال ص ۱۸۳)

مسلمانوں سے مخصوص خطاب کا منشاء بھی یہی ہوتا ہے کہ مدعیان اسلام کو نسبت محمدیؐ کے حق ادا کرنے پر آمادہ کیا جائے جو انسانیت کے حق میں عین رحمت ہے۔

معاشی اتحاد و انقلاب اور وطن دوست اقبال

اقبال مشترک مفادات میں بیجا تعصب کے ہرگز حامی نہیں، وہ تعاون کے داعی ہیں، قرآنی تعلیم کی دعوت بھی یہی ہے۔ تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا و بینکم (مشترک کلمہ و نکتہ پر تعاون کرو)

''سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کیلئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈالکر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کردی ہے اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آجکل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں، جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اسے چاہئے کہ مذہب وملت کے اختلافات کی طرف سے خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے اس لئے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ (مضامین اقبال ص ۱۰۴)

اقبال کے لکھے ہوئے اپنے مختلف دواوین کے دیباچے اس میں شریک ہیں جن مقاصد اور اصول کا ان میں اظہار ہے ان میں سے اکثر خصوصیات مضامین اقبال پر بھی صادق آتی ہیں۔ خصوصاً رموز بیخودی اور پیام مشرق کے تمہیدی بیانات!

مضمون ''ختم نبوت'' اقبالؒ کے کئی بنیادی افکار کا نچوڑ ہے۔ یہ ان کے ایک اہم انگریزی مقالہ کا ترجمہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض طنزیہ استفسارات و تنقیحات کے جواب میں سپرد قلم کیا گیا تھا۔ اس میں ''محکوم کے الہام'' کے نفسیاتی اور اجتماعی نتائج کا بڑی نکتہ رسی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ عنوان اگرچہ مذہبی ہے لیکن نفسیات اجتماع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے گراں قدر سرمائیہ عبرت رکھتا ہے۔

ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ ''آدھی قوم'' کی غلامی سے امریکہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ بعض سیاسی جماعتوں کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا تصور دو تہائی ہندوستانیوں (اچھوتوں اور مسلمانوں) کی غلامی پر بناء کیا گیا ہے۔ سیاست کا ایک ایسا خاکہ تیار کیا جارہا تھا کہ ہندوستان کی اس اکثریت کی تقدیر کو اعلیٰ ذات والوں کے سامراج اور سرمایہ کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔ اس طبقہ نے اپنے اقتدار سے ہندوستان کے اصلی باشندوں کو سماجی اور معاشی غلامی کے جس ''اسفل السافلین'' میں پہنچایا ہے وہ استحصال ناجائز کی تاریخ کا نہایت دردناک باب ہے۔ یہ تاریخ ہند کی سب سے زیادہ طویل المدت مظالم کی ایک داستان ہے۔ عمرانیات کے ماہر اقبال اس قوم کے مزاج اجتماعی کو پہچان گئے۔ اس سیاسی چالبازی کا پردہ چاک کیا۔ ان کے خطبۂ صدارت نے انہیں شاعر ہی نہیں بلکہ تاریخ ساز اقبال بنادیا۔ اس نے بتدریج ہندی سیاست کا رخ بدل دیا۔ جسے ابتدا میں محض شاعری کا ایک کرشمہ سمجھا گیا اب وہ ایک قطعی منزل بن گئی۔ ہندوؤں کے غیر متعصب افراد اور انقلاب پسند گروہ بھی ''حق خودارادیت'' کے اس مطالبہ کو حق بجانب سمجھنے لگے ہیں۔ یہ مضمون ہندوستان کے سیاسی ادب کا ایک اہم باب ہے۔ اس میں انہوں نے معنی دین و سیاست پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کے خیالات ہیں جو

> ''اس امر سے مایوس نہیں ہوگیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کراسکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔'' (مضامین اقبال ص ۱۱۲)

یہی قوت مفادات کی ٹکر کو تعاون سے بدل سکتی ہے۔

اُسلوب بیان

مضامینِ اقبال ان بیش بہا تخیلات کے علاوہ جو ''قیامتِ خرد'' کا مصداق ہیں ہماری زبان کو غیر معمولی حکیمانہ اور عالمانہ اسالیب بیان کی دولت بخشتے ہیں۔ انگریزی اور جرمن زبان میں فلسفیانہ کتابیں پڑھیئے۔ عمرانی علوم کے مضامین کا مطالعہ فرمایئے بڑے بڑے ایجاد کار حکماء اور علماء کے اسالیب بیان کا اندازہ کیجئے۔ اسالیب اقبال انہی کے آثار ہیں۔ جدید علوم وفنون پر جو لوگ اردو میں لکھ رہے ہیں ان کے لئے اقبال کے یہ مضامین معیاری نمونے ہیں۔ کسی قدر عمیق

اور دقیق۔ اردو میں یہ طرز تحریر منفرد یعنی آپ اپنی مثال ہے۔ نہایت پختہ اور پرشوکت ہے۔ ادبی چٹخاروں اور شوخیوں سے خالی۔ لیکن کئی ترکیبیں نہایت بلیغ اور نئی ہیں۔ یہ اقبال کی ایجاد اور عطیہ ہیں۔ طرز اظہار سلیس، رواں نہیں، سنجیدہ اور گراں ہے۔ انگریزی کی علمی تحریریوں کی طرح جابجا جملے ترکیب در ترکیب کے حامل۔ مطالعہ کئی مقامات پر تکرار کا طالب ہوتا ہے۔

جز بہ محنت نہ شود پا بہ رہِ عشق رواں
اشک من خونِ جگر خورد و دویدن آموخت

اقبال کا عام مشغلہ مضمون نویسی یا مقالہ نگاری ہرگز نہ تھا۔ زبان کی لغزشیں کہیں کہیں نمایاں ہیں۔ ابتدا میں جب ان پر اعتراضات کے بم ''صنائع پرستوں'' کی طرف سے برس رہے تھے تو ان کی طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہوگئی لیکن ایک بلند نظر کی طرح ان کو اعتراف تھا کہ

''آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں۔ اگر اہلِ پنجاب مجھ کو..... بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو ان کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی دشوار گذار وادی ہے کہ بالخصوص ان لوگوں کو جو اہل زبان نہیں ہیں۔ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔'' (مضامین اقبال ص ۲۴)

میں چند اشارات کر چکا۔ اب آپ خود ہی اقبالؒ کے ضمیر پاک، خیالِ بلند اور ذوقِ لطیف سے سیر ہو کر استفادہ کیجئے۔ میں کب تک اہلِ نظر کے حضور ''حرف پریشاں'' میں محو رہوں۔

میں نے جب جناب تاج کی فرمائش پر یہ تمہیدی اوراق لکھے تو پشیمانی ہوئی کہ خارِ مغیلاں کو بوستاں کے لئے کیا تحفہ بناؤں۔

ہمیں شرم دارم کہ پائے ملخ را سوئے بارگاہِ سلیمانؑ فرستم
ہمیں ترسم از ریشخندِ ریاحیں کہ خارِ مغیلاں بہ بستاں فرستم

لیکن حسن اتفاق سے اس قول پر نظر پڑی کہ گلدستہ کو گیاہِ سبز سے بھی باندھا جاتا ہے۔

بردستۂ گل نیز بہ بندند گیاہ را

تسکین ہوئی کہ یہ حسبِ حال ہے۔ والسلام

○○○○

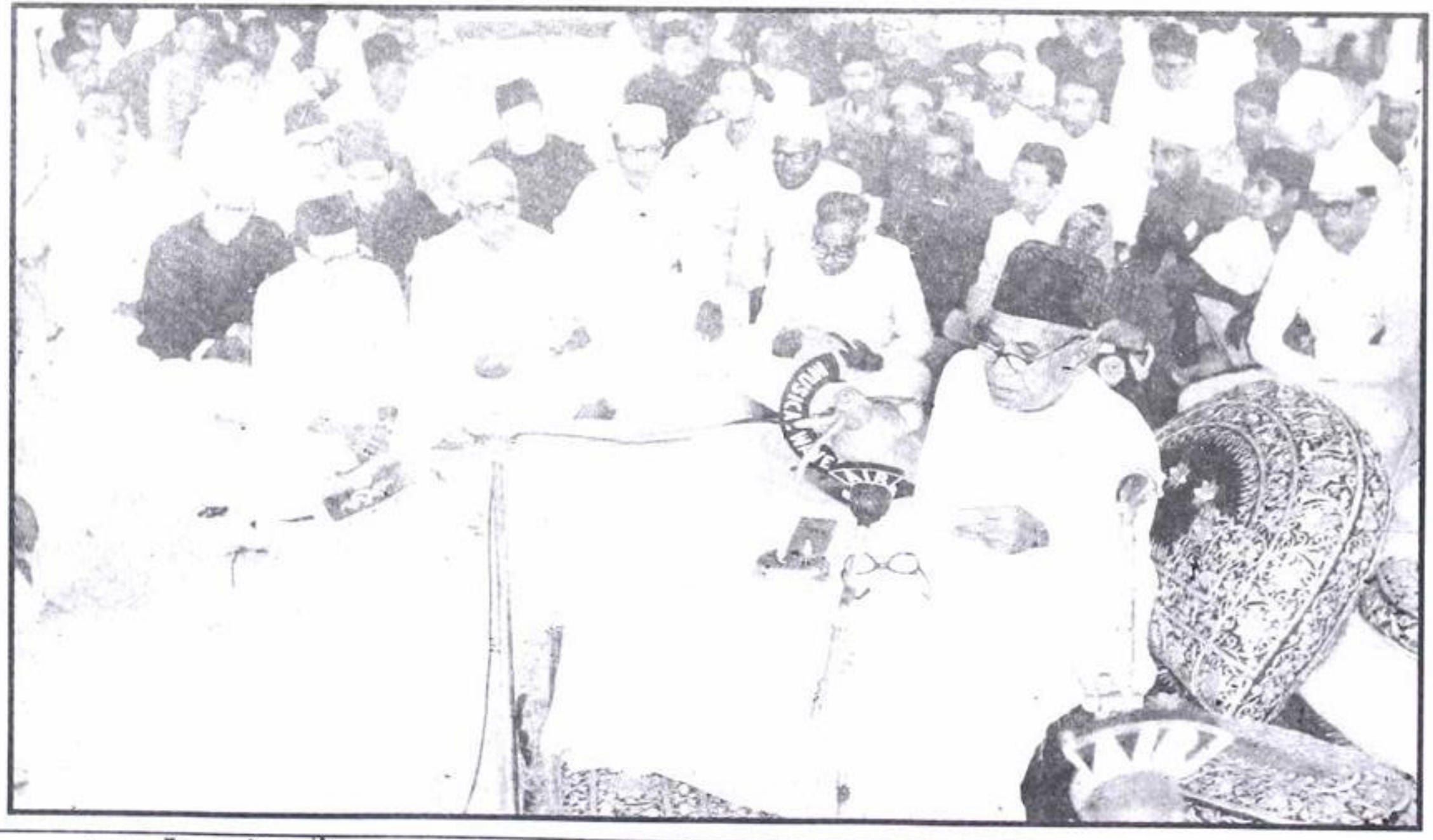

یوم رحمۃ للعلمینؐ (۱۹۶۱ء) کے موقع پر ڈاکٹر سید عبداللطیف مفسر قرآن مخاطب کی سعادت حاصل کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب سید خلیل اللہ حسینی صدر تعمیر ملت کے علاوہ اس وقت کے چیف منسٹر برہمانند ریڈی، جناب ڈاکٹر ایس۔اے۔ منان، جناب فیض زبیری، جناب شاہ مصباح الدین شکیل، جناب مظہر قادری وغیرہ۔

مالک رام

ڈاکٹر سید عبداللطیف

(پیدائش ۱۱ر ستمبر ۱۸۹۱ء ۔ وفات ۴ر نومبر ۱۹۷۱ء مطابق ۱۴ر رمضان ۱۳۹۱ھ)

ڈاکٹر سید عبداللطیف ۶ر صفر ۱۳۰۹ھ (مطابق ۱۱ر ستمبر ۱۸۹۱ء) کو کرنول (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سید جلال الدین مخدوم جہانیانِ جہاں گشت تک پہنچتا ہے۔ ان کی تعلیم اپنے والد بزرگوار مشہور عالم وصوفی شاہ حسین الحسینی کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد مقامی ہائی اسکول بھیج دیئے گئے۔ یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ مدراس کرسچن کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اور کامیاب طلباء میں سب سے اول آئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ سید نواب علی چودھری کے ذاتی سیکریٹری مقرر ہوگئے۔ جو مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن تھے۔ ان کے ہاں سر ابراہیم رحمت اللہ (بمبئی) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں مہارت سے خاص طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد انھوں نے اپنے پبلک اسکول واقع پنج گنی (مضافاتِ بمبئی) کی پرنسپلی کے لئے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دی۔ وہ وہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا، تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں مزید تعلیم کے لئے ان کو انگلستان بھیجا گیا۔

انگلستان میں وہ کنگز کالج (لندن یونیورسٹی) میں پی۔ ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: ''انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر۔''

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کی تو اس کے مندوبین میں ڈاکٹر عبداللطیف بھی تھے۔ گو وہ ہنوز صرف ریسرچ اسکالر تھے اور پروفیسر نہیں بنے تھے۔ (۱۹۲۴ء) میں پی ایچ ڈی کے بعد حیدرآباد واپس آگئے۔

جب یہ انگلستان گئے تھے، تو یونیورسٹی نے ان سے ایک معاہدے پر دستخط کرائے تھے کہ

واپسی پر یہ کم از کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازت کریں گے۔ جونہی دس برس پورے ہوئے، انہوں نے درخواست دی کہ مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پنشن دو ڈھائی سو ماہانہ سے متجاوز نہیں تھی۔ جب یہ حالات نظام میر عثمان علی خان کے علم میں آئے، تو انہوں نے حکم دیا کہ چونکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ملازمت سے دست بردار ہونے سے مدّ عا خدمتِ علم ہے، پس ان کے لئے پوری پانچ سو ماہانہ کی پنشن منظور کی جاتی ہے۔

ترکِ ملازمت کے بعد ۱۹۳۷ء ہی میں انہوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار ''نیوایرا'' (New Era) (عصرِ نو) جاری کیا اور اس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ملک کی آزادی کے لئے اصرار کر رہے تھے، لیکن جس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھا یہ مسئلہ کہ انگریزوں سے گلوخلاصی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر دو رسالے (انگریزی میں) قلمبند کئے تھے۔ (۱) ''مسلم کلچر ان انڈیا'' (ہندوستان میں اسلامی کلچر) اور (۲) ''ڈفرنٹ کلچرل زونز ان انڈیا'' (ہندوستان میں مختلف کلچری خطے) ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا گیا تھا اس کی رو سے ہندوستان کا دستور وفاقی قرار پاتا تھا۔ ہر ایک خطے کے لئے پوری آزادی کی سفارش تھی، مرکز میں صرف دفاع، امور خارجہ، تجارت درآمد و برآمد اور مواصلات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں خاصے معروف و مقبول ہو گئے۔ مسلم لیگ کی فارن کمیٹی کے رکن بھی رہے جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے نظریے کے مطابق پاکستان اسکیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔

اپنی وفاقی اسکیم سے متعلق ان کی فریقین کے زعما سے خط و کتابت رہی۔ بالآخر گاندھی جی نے اگست ۱۹۴۲ء میں مسز سروجنی نائیڈو کی وساطت سے انہیں ممبئی آنے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے ملنے کی دعوت دی۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے شب ۸/اگست کے جس جلسے میں ''ہندوستان چھوڑو'' کی قرارداد منظور کی تھی۔ اس میں ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپریل ۱۹۴۶ء مین ایک اور انگریزی ہفتہ وار کلیرین (Clarion) نام کا نکالا۔ یہ پرچہ (تقریباً) تین برس تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۲۱/مئی ۱۹۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ ان کے وطن کرنول کے مقامی لوگوں کی درخواست پر انہوں نے وہاں عثمانیہ کالج کی پرنسپلی سنبھال لی۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ وہ ۱۹۵۰ء

سے ۱۹۵۲ء تک اس کالج کے پرنسپل رہے۔ جب ایک معقول جانشین کا انتظام ہوگیا، تو مستعفی ہوکر حیدرآباد چلے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں کرنول سے واپسی کے بعد انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر انسٹی ٹیوٹ آف انڈومڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز اور اکاڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمایش کی کہ وہ ان کے شاہکار ''ترجمان القرآن'' کا ترجمہ انگریزی میں کردیں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا بیشتر زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ انہوں نے یہ ترجمہ ۱۹۶۱ء میں تین جلدوں میں مکمل کرلیا۔

اردو داں حلقوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہے گا جو انہوں نے غالب کے عنوان سے انگریزی میں لکھا تھا (حیدرآباد ۱۹۳۲ء) یہ صحیح معنی میں مطالعہ غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ان کی دوسری اہم کوشش غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے پورے کلام کو مرتب کرکے چھاپنا شروع کردیا۔ اس کے ۱۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس مطبع میں جہاں یہ چھپ رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطبوعہ کاغذات اور ان کا تیار کردہ اصل مسودہ بھی جل کر راکھ ہوگئے۔ اس افسوسناک حادثے کے بعد دوبارہ اسے مرتب کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی، یوں یہ مفید کام ادھورا رہ گیا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ حصے کے فرمے کسی طرح تمکین کاظمی کے ہاتھ لگ گئے تھے، جو انہوں نے مولانا امتیاز علی خان عرشی کو بھیج دیئے اور انہوں نے دیوان کا نسخہ عرشی مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہرحال ڈاکٹر عبداللطیف ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ دیوان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔

ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۰ء میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔

آخری ایام میں انھوں نے ''ڈاکٹر سید عبداللطیف قرآنک اینڈ اورینٹل اسٹڈیز ٹرسٹ'' کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔

۴ر نومبر ۱۹۷۱ء (۱۴ر رمضان ۱۳۹۱ھ) کو ڈاکٹر سید عبداللطیف کا انتقال ہوگیا۔

(ماخوذ از تذکرۂ معاصرین، جلد اول، مطبوعہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۲ء میں مالک رام کی تحریر سے تلخیص)

The works of Dr. Syed Abdul Latif

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1924)
2. Ghalib – A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1927)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue – Plan of Federal Constitution of India.
   Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India – edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1937)
11. Prayers of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought – A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1958)
14. Bases of Islamic Culture (1959)
15. Madras University Lectures :
    Principles of Islamic Culture (1961)
16. Was the Prophet of Islam Unlettered? (1964)
17. The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)
18. The Call of the Quran (1966)
19. Faith and Action – The Quranic View (1967)
20. The Unity of Man – The Quranic View (1968)
21. Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad – A rendering into English in three volumes Vol I (1962) Vol II (1967) Vol III (1978)
22. Al-Quran rendered into English (1969)
23. The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)

انگریزی خط کا عکس

Dr. Sir Mohd Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister at Law

Lahore

Dated ______ 193

5th Dec. 1935

Dear Dr. Abdul Aziz,

The idea of starting a journal of the kind you mention in your letter is excellent. I have always felt it with sorrow that men of my generation have not done their duty towards the younger generation. We are leaving them problems which, unequipped as they are, they will find it difficult to solve. I have no doubt that the voice of Islam will meet a great need of the times. Unfortunately I can be of no use to you at present. I have been suffering from a bad throat disease for the last 20 months or so & am now thinking of going to Vienna for treatment. If I ~~return~~ regain my health I shall be only too glad to do all that I can for you. For the present I would advise you to make 'Islamic Jurisprudence' a special item in your program. I consider it the greatest legacy that Islam has left to the modern world. Even the world of Islam has not yet properly understood its value.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

انگریزی کا متن

Dr. Sir Mahammad Iqbal Kt.
M. A. Ph. D. L. L. D.
Barister-at-Law

Lahore

Dated 1st Nov. 1935

Dear Dr. Abdul Latif,

The idea of starting a journal of the kind you mention in your letter is excellent. I have always felt it with shame that men of my generation have not done their duty towards the younger generation. We are leaving their problems, which unequipped as they are, they will find it difficult to solve. I have no doubt that the Voice of Islam will meet and grasp need of the times. Unfortunately, I can be of no use to you at present. I have been suffering from a bad throat disease for the last 20 months or so and am now thinking of going to Vienna for treatment. If I regain my health I shall be only too glad to do all that I can for you. For the present I would advise you to make "Islamic Jurisprudence" as special item in your programe. I consider it the greatest legacy that Islam has left to the modern world. Even the world of Islam has not yet properly understood its value.

Yours sincerely,
Mohammad Iqbal

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم اے پی ایچ ڈی ایل ایل ڈی
بیرسٹر ایٹ لا

لاہور
یکم نومبر ۱۹۳۵ء

ڈیر ڈاکٹر عبداللطیف

آپ نے اپنے خط میں جس طرز کا رسالہ شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے وہ بہت عمدہ ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ احساسِ ندامت رہا ہے کہ میری نسل کے لوگوں نے نوجوان نسل کے تئیں اپنی ذمہ داری نہیں نبھائی۔ ہم ان کے مسائل جن کو وہ اپنی بے بضاعتی کے سبب حل نہیں کر سکتے، یونہی چھوڑ دے رہے ہیں۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''وائس آف اسلام'' وقت کی ضرورت کو پورا کرے گا۔ بدقسمتی سے فی الحال میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ پچھلے بیس مہینوں سے میں حلق کے ایک تکلیف دہ عارضے کا شکار ہوں۔ اس لئے میں علاج کے لئے ویانا جانے کی سوچ رہا ہوں۔ اگر میں صحت یاب ہو جاؤں تو مجھے آپ کے لیے کچھ کر کے بیحد خوشی ہوگی۔ فی الحال میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ اسلامی فقہ کو اپنے پروگرام میں خصوصی اہمیت دیں۔ میں اسے وہ عظیم تر ورثہ سمجھتا ہوں جو اسلام نے آج کی دنیا کے لئے چھوڑا ہے۔ خود عالمِ اسلام نے اس کی صحیح قدر و قیمت تا حال نہیں سمجھی۔

مخلص
محمد اقبال

انگریزی خط کا عکس

Lahore
31st Dec. 1935

My dear Dr. Latif,

Thanks for your letter. As I conceive the Voice of Islam I think it must discuss modern Islam its religious & political history & its politics within or without India. I do not know whether the Nizam Govt. will allow you to discuss the politics of Islam, but even if it does not a good deal remains for you to discuss with a view to combat the ignorance, the scepticism, the despair & the inferiority-complex of the modern westernised Muslim in India. If therefore you can make your paper financially sound the enterprise is, in my opinion, worthwhile. The greatest difficulty in your way is that you will not find many Muslims who possess a real insight into things which you want to discuss. Our English & Urdu Magazines devoted to Islam are only third class stuff.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

انگریزی متن

Lahore
Dated 31st **Dec. 1935**

My dear Dr. Latif,

Thanks for your letter. As I conceive the Voice of Islam, I think it must discuss modern Islam, its religious and political history and its politics within or without India. I do not know whether the Nizam Government will allow you to discuss the politics of Islam; lest even if does not, a good deal remains for you to discuss with a view to combat the ignorance, the scepticism, the despair and the inferiority complex of the modern western muslim in India. If therefore you can make your paper financially sound the enterprise is in my opinion,. worth while. The greatest difficulty in your way is that you will not find many muslims who possess a real insight into things which you want to discuss. Our English and Urdu magazines devoted to Islam are only third class stuff.

Yours sincerely,
Mohammad Iqbal

لاہور

۳۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء

مائی ڈیر لطیف

آپ کے خط کا شکریہ۔ جہاں تک ''وائس آف اسلام'' کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس (رسالے) کو عصرِ حاضر کے اسلام اور اس کی مذہبی اور سیاسی تاریخ اور ہندوستان اور بیرون ہند کی اسلامی سیاست کو موضوع بنانا چاہئے۔ میں نہیں جانتا کہ حکومتِ نظام آپ کو اسلامی سیاست پر بحث کرنے کی اجازت دے گی کہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو آپ کو ہندوستان کے مغرب زدہ مسلمانوں کی جہالت، تشکیک، ناامیدی اور احساس کمتری کے خلاف لڑنے کا وسیع موقع ہے۔ اگر آپ مالی اعتبار سے اپنے رسالے کو مستحکم بنا سکیں تو میری رائے میں آپ کی کوشش مناسب ہے۔ آپ کے راستے کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے جن باتوں کو آپ موضوعِ بحث بنانا چاہتے ہیں اس کی حقیقی بصیرت رکھنے والے کئی مسلمان آپ کو نہیں ملیں گے۔ ہمارے انگریزی اور اردو کے جو رسائل اسلام سے متعلق ہیں، صرف تیسرے درجے کا مواد فراہم کرتے ہیں۔

مخلص

محمد اقبال

انگریزی خط کا عکس

Dr. Sir Mohammad Iqbal
BAR-AT-LAW

MAYO ROAD
Lahore 17th Sept 1937

My dear Doctor Latif,

My eyesight is getting bad & the doctors have told me not to do any reading or writing. My children's governess has read your address to me. It is indeed excellent both in idea & expression. I do not quite understand what exactly you mean by what you say on p. 11. "you may talk of this outlook on life ... with absolutely no reference to God, if you are so minded." An Ummat or community is impossible without the mental foundation of like-mindedness. And like-mindedness is secured in Islam by God as conceived in the Koran. Your sentence gives the impression that Islam as an outlook on life & society is consistent with atheism. I cannot conceive that you mean this but I would like to have a little more light on this subject.

I am glad that Moslim Culture Society has given you some mental occupation & hope that it will do much good to the Moslims of Hyderabad. Hoping you are well

Yours sincerely

Mohammad Iqbal

انگریزی متن

Dr. Sir Mohammad Iqbal
Bar At Law

Maya Road
Lahore 17th Sept. 1937

My Dear Doctor Latif,

My eyesight is falling bad and the doctors have told me not to do any reading or writing. My children's Governess has read your address to me. It is indeed excellent both in idea and expression. I do not quite understand what exactly you mean by what you say on p. 11. "You may talk of this outlook on life... with absolutely no reference to God, if you are so minded." An Ummat or Community is impossible without the mental foundation of like-mindedness and like-mindedness is seemed in Islam by God as conceived in the Koran. Your sentence gives the impression that Islam as an outlook on life and society is consistent with atheism. I can not conceive that you mean this, but I would like to have a little more light on this subject. I am glad that Muslim Culture Society has given you some mental occupation and hope that it will do much good to Muslims of Hyderabad. Hoping you are well.

Yours sincerely,
Mohammad Iqbal

ڈاکٹر سر محمد اقبال
بیرسٹر ایٹ لا

میوروڈ
لاہور
۱۷ر ستمبر ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر لطیف

میری بینائی کمزور ہوتی جارہی ہے اور ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ میں لکھنے پڑھنے کا کام نہ کروں۔ میرے بچوں کی نگرانکار (گورنس) نے آپ کا ایڈریس مجھے پڑھ کر سنایا۔ یہ اپنے خیالات اور بیان کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے۔ آپ نے صفحہ 11 پر ارشاد فرمایا ہے کہ ''آپ زندگی کے اس نظریئے کے تعلق سے خدا کے حوالے کے بغیر بھی بات کر سکتے ہیں۔'' میں آپ کے مافی الضمیر کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہوں۔ کوئی امت یا قوم ہم خیالی کی ذہنی بنیاد کے بغیر ناممکن ہے۔ اسلام میں ہم خیالی کا تصور وہی ہے جو اللہ نے قرآن مجید میں پیش کیا ہے۔ آپ کے جملے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسلام کا نظریۂ حیات یا نظریۂ سماج الحاد سے ہم آہنگ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ ایسا سوچتے ہیں لیکن میں چاہوں گا کہ آپ اس موضوع پر کچھ اور روشنی ڈالیں۔

مجھے خوشی ہے کہ مسلم کلچر سوسائٹی نے آپ کو ایک ذہنی مشغلہ فراہم کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ مسلمانانِ حیدرآباد اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص
محمد اقبال

محمد ظہیر الدین

ڈاکٹر لطیف! چند یادیں

پیدائش ۱۱ر ستمبر ۱۸۹۱ء ۔ وفات ۴ر نومبر ۱۹۷۱ء (۱۴ر رمضان ۱۳۹۱ء)

(ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کے انتقال پر تعزیتی جلسہ منعقدہ ۱۴ر نومبر ۱۹۷۱ء میں پڑھا گیا)

کبھی جسم کے کسی حصہ پر کوئی چوٹ لگتی ہے تو فوراً تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ چند لمحات گذرنے لگتے ہیں تو رفتہ رفتہ درد کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ٹیس بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی ذہن کی کیفیت بھی ایسی ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا صدمہ سہولت سے سہار جائے اور کبھی چھوٹی سی بات بھی گھنٹوں متاثر کردے۔ کچھ ایسی ہی بات تھی جب ۴ر نومبر کی دوپہر میں یہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر لطیف کا انتقال ہوگیا۔ باوجود اس قلبی ربط کے جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے تھا دل کو دھکا نہیں لگا۔ کان جیسے اس متوقع حادثہ کی خبر سننے تیار تھے لیکن جوں ہی دوڑا دوڑا ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچا اور ان کے چہرہ کا دیدار کیا۔ دل ڈوبنے لگا اور احساس ستانے لگا کہ ہائے کون اٹھ گیا؟ ہم نے کسے کھودیا؟

رمضان کے مبارک دنوں میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انہیں طلب کرلیا۔ دفعتاً خیال آیا ایک خادم قرآن کی خدمات کے حسنِ قبول کی یہ بڑی قوی دلیل ہے۔

ڈاکٹر لطیف کی شخصیت کا اثر جو میرے دل پر نقش ہے، بیان کرنے سے پہلے شاید بے محل نہ ہوگا۔ اگر میں ان سے اولین ملاقات کا ذکر کروں۔ غالباً بات ۵۰ سال پہلے کی ہے۔ مجھے ان کے مکان پر ایک تحریری مقابلے کے عنوانات کے انگریزی ترجمہ کے سلسلے میں جانا پڑا۔ دروازہ پر آواز دی۔ ''ڈاکٹر صاحب'' اندر سے جواب آیا ''کون۔؟'' میں نے کہا ''میرا نام ظہیر الدین ہے اور جناب سید خلیل اللہ حسینی (مرحوم) نے مجھا بھیجا ہے'' اچھا ٹھہرو، آتا ہوں، برآمدہ کا جالی دار کھولا۔ سفید لنگی اور ململ کا کرتا پہنے ہوئے آئے۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے پھیلی ہوئی انکھوں

سے میرا جائزہ لیا۔ رسمی تعارف ہوا۔ حکم ہوا۔ ''عنوانات پڑھو'' میں نے ایک عنوان پڑھا ''حضرت علیؓ کی اسلامی خدمات'' کیا بولا؟ پھر دوسرا سوال داغ دیا'' کیا حضرت علیؓ کی کوئی غیر اسلامی خدمات بھی تھیں'' پھر فرمایا ''غیر ضروری الفاظ مت ٹھونسو صرف حضرت علیؓ کی خدمات کافی ہے''۔ یہ تھا! ملاقات کا پہلا نقش! اس سے قبل ۱۹۵۴ء میں ''بیت الامت'' (نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی دیوڑھی) میں ایک علمی محفل کی صدارت کرتے دیکھا۔ اس وقت میں بزم احباب کے کم عمر نوگرفتاروں میں تھا۔ انہوں نے کیا کہا مجھے کچھ پلے نہ پڑا۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ انگریزی ادبیات اور اسلامیات کے بہت بڑے استاد ہیں۔

چند برسوں بعد ڈاکٹر لطیف کی مشہور کتاب The Mind Al Quran Builds ہاتھ لگی۔ مطالعہ کے دوران ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ذہن کی گرہیں کھلنے لگی۔ دل ان کا گرویدہ ہوگیا۔ بعد میں اسٹڈی سرکل کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کا موقع ملا۔ ان کی کتابیں پڑھی تھیں اب شخصیت کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کی دلکش شخصیت نے رنگ جمایا۔ ڈاکٹر صاحب کی سادہ مزاجی اور خوش دلی نے حوصلہ بڑھایا۔ اکثر اوقات بڑی دیر تک بات چیت ہوتی رہتی اور میں اسلام کے بارے میں ہو یا کوئی اور بات ایسے سوالات کرتا جو بعد میں مجھ جیسے خود بے تکے معلوم ہوتے۔ یوں تو ان کی خدمت میں ایسے لوگ بھی حاضر رہتے جن کا شمار اس وقت نامور اساتذہ، دانشوروں اور علماء میں ہوتا، لیکن یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص وصف تھا، جو دل کو بہت بھاتا کہ وہ مجھ جیسے ادنیٰ طالب علموں کی سطح تک بڑی سہولت سے نیچے اتر آتے، یوں کہ دل پر نہ تو ان کی علمیت کا اثر ہوتا نہ پیرانہ سالی کا لحاظ۔ بلکہ اکثر ان کی بذلہ سنجی کے سہارے بے تکلف گفتگو کرتا میں ان کے ساتھ یوں مودب نہ ہوتا جیسے اور ہوتے اور شاید یہ طالب علمانہ انداز انہیں پسند بھی آتا۔ ان کی بذلہ سنجی اور بڑھ جاتی۔ یہ ان کے بڑکپن کی دلیل تھی۔ ہماری زندگی میں معاملات کی نوعیت یوں ہوگئی ہے کہ ہم سے اکثر اکثر کو گوارا کر لیتے ہیں، لیکن یہاں بات دوسری تھی ملتے تو دل کو خوشی ہو نہ تکلف نہ بے جا پاس ادب۔ لیکن ملنا جلنا تو کبھی ایسے علماء سے بھی رہا جو منبر و محراب کی آرائش رہے لیکن جب جائیں تو باریابی کے لئے منتظر رہیں۔ بات ہو بھی تو ایسی روکھی پھیکی کہ طبیعت بدمزہ ہو جائے۔ ایسے وقت ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ کا قائل ہونا پڑتا۔

ان کی شخصیت میں بہت سی باتیں غیر معمولی تھیں۔ ایک دور تھا کہ سیاسی دانشور کی حیثیت

سے وہ مشہور تھے۔ ملک کے چوٹی کے سیاست داں چاہے وہ کانگریسی ہوں یا لیگی ہوں ان کے قدرداں اور مشوروں کے طالب تھے۔ انگریزی میں ان کی قادر الکلامی، تبحر اور عبور کے بارے میں کہنے کی ضرورت نہیں۔ کنگس کالج کے پروفیسر کا انہیں ایم اے کے بغیر پی ایچ ڈی میں داخلہ دے دینا اور تین سال کے بجائے دو سال میں مقالہ کی تکمیل کرنا ان کی لیاقت کا بڑا ثبوت تھا۔ ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت کو دیکھ کر مولانا آزاد نے اپنی تفسیر کے ترجمہ کا کام سونپا۔ روحانی اعتبار سے وہ ایک بڑے سلسلہ سے متعلق تھے۔ لیکن مذہبی دکان داری انہوں نے نہیں کی۔ شاید مشرق سے زیادہ مغرب نے انہیں جانا اس وقت نامور مورخ ٹائین بی اور کینٹول اسمتھ جب ہندوستان آئے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر اقبال نے لاہور میں پرنسپلی کی پیش کش کی تھی اور حکومت نے بھی پدما بھوشن کا خطاب دے رکھا تھا۔ لیکن ان سب باتوں سے ہٹ کر ان کی قلندرانہ اداؤں اور ندرت فکر کا دل پرستار تھا۔

علمی کاموں میں ڈاکٹر صاحب بڑی دقتِ نظری سے کام لیتے۔ طرز بیان منطقی اور سلجھا ہوا۔ عبارت چست اور جامع الفاظ کا انتخاب یوں کے جیسے تراش خراش کے بعد نگینے جڑ رہے ہوں۔ ایک مرتبہ کل ہند مجلس تعمیر ملت کے سالانہ جلسہ یوم رحمۃ للعالمین میں تقریر کے لئے مدعو کیا گیا تقریر کا عنوان تھا The Call of the Quran تقریر dictate کروائی مسودہ ٹائپ ہونے کے بعد شاید کوئی چار مرتبہ پڑھوا کر سنا۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ترمیم کرتے جاتے۔ میں نے عافیت اسی میں تلاش کی تقریر طباعت کے لئے جلد ہی پریس میں دے دوں۔ تیسرے دن فون آیا۔ ''تیرا بھی جواب نہیں''۔ پھر دوبارہ فرمایا ''تیرا بھی جواب نہیں'' اور فرمایا ''اس کا انگریزی میں ترجمہ کر'' میں نے کہا ڈاکٹر صاحب ''میں کیا ترجمہ کرسکتا ہوں؟'' ''فرمائیے'' ''کیا حکم ہے'' فوراً کہا None to compare you میں نے پوچھا کہ آخر بات کیا ہوگئی۔ بولے دو دن سے انتظار کر رہا ہوں تقریر لے کر کہاں غائب ہوگیا۔ میں نے کہا پریس میں دے دی ہے۔ فرمایا Strike order ابھی مت دے۔ میں خود پروف دیکھوں گا۔ خود پروف دیکھا اور کئی غلطیاں نکالیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ علمی کاموں میں ان کی عرق ریزی اور احساس ذمہ داری کا کیا عالم تھا۔ ان کو خیال تھا کہ ایک ایک لفظ کا وزن ہوگا۔ بہت عرصے پہلے ہی آپریشن کے بعد ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔ دن میں بھی ٹیبل لیمپ کی مدد کے بغیر پڑھ نہ سکتے۔ کچھ نہ کچھ عوارض لپٹے

رہتے۔ لیکن قرآن مجید کے ترجمے کے کام میں ان کے شغف اور غیر معمولی انہماک کو دیکھ کر خیال ہوتا کہ یہ کام ڈاکٹر لطیف خود نہیں کر رہے ہیں بلکہ کوئی اور قوت ان سے یہ کام کروا رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب کہ غالباً پانچ سال پہلے ان کے دماغ کی شریانیں متاثر ہو گئیں۔ وہ دواخانہ عثمانیہ میں شریک تھے نامور فزیشین ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے زیر علاج تھے۔ عیادت کے لئے گیا۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے نہایت ہشاش بشاش پایا۔ مختصری بات چیت کے بعد پوچھ بیٹھا کہ ترجمہ کا کام کس نوبت پر ہے! غالباً دو چار پارے اور باقی تھے۔ دل میں وسوسہ آیا خدانخواستہ ڈاکٹر صاحب کو کچھ ہو گیا تو ترجمہ ادھورا رہ جائے۔ کچھ دیر کے لئے سکوت طاری ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے شاید میری اس قلبی کیفیت کو بھانپ لیا اور اپنے خاص لہجے میں فرمایا "ارے فکر کیوں کرتا ہے! میں نے بڑے حضرت (اللہ میاں) سے کہہ دیا ہے کہ میں وہاں آ کر کونسا تیر ماروں گا میرے جیسے آپ کے پاس تو ۵۶ ہیں۔ مجھے چند دن اور رہنے دو۔ کام ختم ہونے کے بعد آ جاؤں گا" ۔ ڈاکٹر صاحب کی زبردست قوت ارادی تھی کہ اس کام کے دوران انہوں نے بیماری کو کبھی اپنے اوپر مسلط ہونے نہیں دیا۔ جسم بگڑتا رہا لیکن قوائے ذہنی شاداب رہے، ذہن کی خلاقی میں فرق نہ آیا۔ کبھی کبھار عبارت کے سلسلے میں جانا ہوتا تو بادل محزوں جاتے لیکن وہ تھے کہ ہنسا کر واپس کرتے۔ ترجمہ کا کام مکمل ہو گیا ذاتی صرفہ سے چھپوایا اور اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب زندہ رہنے کے بارے میں سنجیدہ نہ رہے تھے اور کوچ کے لئے تیار تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن میں اقبال کی طرح یہ یقین جاں گزیں تھا کہ موت کا فرشتہ بدن کو تو چھو سکتا ہے لیکن وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے۔ گفتگو کے دوران قرآن مجید کے آیت لترکبن طبقاً عن طبق اکثر پڑھتے۔ پچھلے چند ماہ سے وہ اس دنیا سے سفر کی تیاری بڑے ہی سکون و اطمینان سے کرنے لگے تھے۔ ایک دن انسان کی عظمت اور قوت کا تذکرہ تھا۔ "کہنے لگے کہا جاتا ہے منکر نکیر قبر میں آ کر سوال کریں گے میں پوچھوں گا۔ کدھر؟ تم نے تو ہم کو سجدہ کیا تھا اور ہم سے سوال؟ چلو ہٹو اللہ میاں سے direct negotiation کروں گا"۔؟ ڈاکٹر صاحب ایسی ہی باتیں تھیں جن سے ان کی شوخی اور افتادِ طبع کا پتہ چلتا۔ لیکن ان پر تبصرہ کا موقع نہیں۔

مسلمانان ہند کے تذکرہ پر اکثر وہ کبیدہ خاطر ہو جاتے۔ نام نہاد اور روایتی علماء و

مشائخین سے نالاں تھے۔ ان کی ہی زبان معلوم ہوا تھا کہ جب وہ اپنے بھائی کے انتقال کے بعد پاکستان گئے تو مس فاطمہ جناح نے مالی سہولتوں اور فلیٹ کا پیش کش کیا اور ترغیب دی کہ وہ منتقل ہو جائیں۔ لیکن انہوں نے انکار کیا اور ہندوستان میں رہ کر خدمت کرنے کو ترجیح دی۔ اسی سلسلہ میں بڑے درد سے کہنے لگے۔ ہوسکتا تھا کہ میں خوش رہوں لیکن اپنے بھائیوں کو تکلیف میں دیکھ کر کیا قبر میں بھی میری ہڈیوں کو چین ملے گا؟

آخری زمانہ میں ملاقاتوں سے محرومی رہی۔ بھلا ہوا ایک تلگو کے عالم کا، قصور میرا نہ تھا لیکن جس کو The mind Al Quran Builds کے تلگو ترجمہ کے لئے ڈکٹر صاحب نے تین سو روپے دئے تھے اور پھر وہ غائب ہو گئے اس کی رسائی میرے توسط سے ہوئی تھی اس لیے میں منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ لیکن جب ملنا ہوا تو زبان پر اس کا تذکرہ بھی نہ آیا۔ اس دوران انہوں نے کئی مرتبہ آنے کے لئے کہلوایا تھا۔ اب یہ باتیں یاد آتی ہیں اپنی محرومی پر افسوس ہوتا ہے لیکن شرمندگی کے مارے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہمارے روابط میں ہم نے ایک ناروا رویہ اختیار کر لیا ہے یعنی ''قدر نعمت بعد زوال نعمت''، یعنی کسی چیز کے نقصان اور کمی کے بعد اس کا احساس ہوگا۔ ڈاکٹر لطیف کے بارے میں یہ بات صادق آتی ہے۔ ہم نے ان کی قدر نہیں کی نئی نسل ان کی خدمات سے آگاہ نہیں ہے لیکن شاید اب کے بعد کا خلاء ان کے مقام اور مرتبہ کو محسوس کروائے گا۔ اگر وہ مغرب میں ہوتے تو ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے شہرت دولت مقام و مرتبہ پاتے۔ لیکن یہ ان کی بدقسمتی اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ ہندوستان میں اور مسلمانوں میں پیدا ہوئے تھے۔

اس میں خود ان کے قلندرانہ مزاج کا دخل ہے۔ دوسرے ان کے بعض خوشہ چین بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔

○○○○

ڈاکٹر سید عبداللطیف

اقبال سے ملاقات۔ سفرِ لاہور

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ میں اپنے قدیم دوست مرحوم مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے ہمراہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ یہاں مجھے ڈاکٹر اقبال کا ایک خط ملا۔ جس میں انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کا ذکر کیا تھا اور یہ خواہش کی تھی کہ میں علی گڑھ سے راست لاہور چلا آؤں اور کم از کم دو ہفتے ان کے ساتھ گزاروں تو انہیں بڑی خوشی ہوگی، چنانچہ میں علی گڑھ سے سیدھا لاہور پہنچا اور کوئی تین ہفتے ان کے ساتھ رہا، میرا بستر انہیں کے کمرہ میں کیا گیا تھا۔ اس قیام کی یاد ابھی تک میرے دل میں تازہ ہے۔

اس دوران میں انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک معتد بہ مدت کے لیے لاہور میں سکونت اختیار کروں تا کہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی کچھ خدمت کرسکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبہ میں ان کی مدد کرسکوں، وہ منصوبہ یہ تھا۔

انہوں نے اسلامی اصولِ فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلمبند کیا تھا۔ یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ یہ محسوس کررہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانہ میں، ان نوٹس کی ترتیب وتہذیب اور انہیں کوئی قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لیے دقت سے خالی نہیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔

میں بہت خوشی سے اس کام کو انجام دینے کے لئے آمادہ تھا لیکن ایک دشواری میری راہ میں حائل تھی۔ ان دنوں میری اہلیہ مرحومہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں اور ایسے وقت میرا حیدرآباد سے باہر رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ بیمار کی حالت بہتر ہو جائے تو میں چند دن کے لیے لاہور آسکوں گا اور نوٹس کو ان کی حسبِ خواہش ترتیب دوں گا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ بیمار کا علاج لاہور میں بھی خاطر خواہ کیا جاسکتا ہے انہوں نے فرمایا کہ ماڈل ٹاؤن میں جہاں کی آب وہوا بہت اچھی ہے میرے لیے ایک مکان کا انتظام کیا جاسکتا ہے اس وقت چند مکان اس رقبہ میں زیر

تعمیر تھے انہوں نے خواہش کی کہ میں ان میں سے کسی کا انتخاب کرلوں۔ اس زمانے میں ایک مخلص نوجوان گرایجویٹ مسٹر محمد شفیع روزانہ ان کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے مجھے ان کے ہمراہ ماڈل ٹاون کے زیرتعمیر مکانات دیکھنے کے لیے بھیجا۔ جب موٹر کار گھر سے باہر نکل رہی تھی تو ڈاکٹر اقبال کے کمسن صاحبزادے جاوید نے خواہش کی کہ وہ ساتھ چلیں گے۔ چنانچہ انہیں گاڑی میں بٹھالیا گیا۔ ماڈل ٹاون میں کچھ دیر تک رہنا پڑا۔ ہوا یہ کہ ماڈل ٹاؤن کے ایک مکان میں پہلے ہی سے میرے ایک دوست ڈاکٹر محمد شفیع پروفیسر اورینٹل کالج مقیم تھے۔ انہوں نے اصرار کر کے کچھ دیر ہمیں روک لیا۔ ڈاکٹر اقبال کو یہ خبر نہیں تھی کہ جاوید ہمارے ساتھ ماڈل ٹاؤن گئے ہیں۔ گھر میں بچے کی غیر موجودگی ان کے لیے باعثِ پریشانی ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب ہم واپس ہوئے اور ہماری کار کوٹھی کے علاقہ میں داخل ہوئی تو دیکھتے کیا ہیں کہ ڈاکٹر اقبال اپنے کمرے سے نکل کر ورانڈے میں باہر پریشان حال بیٹھے ہیں، جوں ہی جاوید موٹر سے اترے اور ڈاکٹر اقبال کی نگاہ ان پر پڑی تو ایک دل دوز منظر دیکھنے میں آیا۔ وہ بیتابی سے آگے بڑھے اور جاوید کو سینے سے لگالیا۔

ماڈل ٹاون سے واپسی کے بعد میں نے ڈاکٹر اقبال کو بتایا کہ میں حیدرآباد پہنچنے کے بعد اپنی بیوی سے دریافت کروں گا کہ آیا وہ لاہور میں سکونت اختیار کرنے کے لئے آمادہ ہیں، جہاں ان کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

ان دنوں ڈاکٹر اقبال دہلی کے حکیم نابینا صاحب کے زیرعلاج تھے انہوں نے یہ طے کیا کہ دہلی آجائیں تاکہ حکیم صاحب موصوف کی شخصی توجہ میں ان کا علاج جاری رہے، دہلی میں افغان قونصلیٹ میں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا، چنانچہ میں انہیں اپنے ہمراہ دہلی لیتا آیا اور انہیں قونصلیٹ پہنچا کر حیدرآباد واپس چلا آیا۔ یہی ان سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد اس عظیم المرتبت روح نے دارفانی کو خیرباد کہا۔

حیدرآباد واپس ہونے کے بعد میں نے اپنے یونیورسٹی کے احباب کے تعاون سے ''مسلم کلچرل سوسائٹی حیدرآباد'' کے نام سے مخصوص اصحابِ علم پر مشتمل ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اسلامی تہذیب کا تحقیق و مطالعہ تھا۔ اسی نوتشکیل شدہ ادارہ کے زیراہتمام سب سے پہلا ''یوم اقبال'' منایا گیا اس تقریب کے انعقاد سے مقصود یہ تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ ان کی عمر کا جہاز

کنارے آلگا تھا ان کی خاطر جمعی اور دل بڑھانے کا کچھ سامان کیا جائے۔

حیدرآباد کے اصحابِ علم نے ان کے تعلق سے اس درجہ عقیدت واحترام کا مظاہرہ کیا کہ ایچ ای ایچ نظام سابع کے ولی عہد نے خود اس تقریب کے افتتاح کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی اور مہاراجہ سرکشن پرشاد نے جوان دنوں حیدرآباد کے وزیراعظم تھے اس کی صدارت کی، اس تقریب کے داعی کی حیثیت سے میں نے بھی اس موقعہ پر ایک خطبہ پڑھا تھا جس کا عنوان یہ تھا۔

''عالمِ انسانی کی وحدت۔ اقبال کی نظر میں''

یہ ۷/جنوری ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔ پہلے یوم اقبال کی رودادیں اخباروں کے تراشوں کی صورت میں ڈاکٹر اقبال کو بھیجی گئیں۔ اس موقع پر انہوں نے جو خط ہمیں لکھا تھا اس میں اپنے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے بعد مستعد افراد کا ایک ایسا گروہ پیچھے چھوڑے جارہے ہیں جوان کی جلائی ہوئی مشعل کو ہمیشہ روشن رکھے گا۔ یہ خط مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ اس واقعہ کے تین ماہ بعد ان کی عظیم المرتبت روح راضی برضائے الٰہی ہوکر اپنے خالق سے جاملی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اصولی فقہ اسلامی سے متعلق ڈاکٹر اقبال کے وہ نوٹس کہاں ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے میں نے چند سال قبل لاہور کے بعض دوستوں کو لکھا تھا کہ وہ ان نوٹس کا پتہ چلائیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ابھی چند دن پہلے مجھے خیال ہوا کہ مسٹر محمد شفیع کو شائد ان نوٹس کے متعلق کچھ علم ہو۔ چنانچہ میں نے لاہور میں اپنے ایک دوست کو لکھا کہ وہ محمد شفیع کے پتے سے مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں خود محمد شفیع کا خط مجھے وصول ہوا ہے انہوں نے انگریزی میں لکھا ہے جس کے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

''یہ جان کو مسرت ہوئی کہ آپ آج بھی اسی میدانِ عمل میں مصروف ومنہمک ہیں جس کی کشش آج سے تیس سال قبل آپ کو لاہور کھینچ لائی تھی جب کہ اقبال کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے آپ کی تشریف آوری ہم سب کے لئے ذہنی اور روحانی ضیافت کا باعث ہوئی تھی۔''

''آپ نے جن امور کے متعلق دریافت فرمایا ہے آپ اس خصوص میں اگر ممتاز حسن صاحب مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان کراچی کو لکھیں اور اسلامی فقہ سے متعلق اقبال کے نوٹس کے بارے میں دریافت فرمائیں تو بہتر ہوگا وہ اقبال کے بڑے معتمد اور قدرداں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تسلی بخش جواب دیں گے۔ آپ ان سے میرا ذکر بھی فرماسکتے ہیں وہ

یقیناً ضروری مواد آپ کو مستعار دینے کا انتظام کریں گے۔''

''اب آپ کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔ گزشتہ خط میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ کی ایک آنکھ کی بینائی بالکل جاتی رہی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ اقبال کی بھی بائیں آنکھ بچپن میں ایک حادثہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی تھی۔''

''میں ماڈل ٹاون میں مقیم ہوں یہ وہی مقام ہے جہاں قیام لاہور کے زمانے مین ایک مرتبہ آپ بھی تشریف لائے تھے آپ کو یاد ہوگا کہ اس دن اقبال کسی درجہ سراسیمہ اور پریشان ہوگئے تھے کیونکہ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ جاوید ہمارے ساتھ ہو لیے تھے مجھے اس درجہ مسرت ہوگی اگر آپ ان دنوں جب کہ لاہور میں بہار کا موسم ہے یہاں تشریف لائیں اور چند روز ہمارے ساتھ قیام فرمائیں۔''

(ماخوذ از 'اوراق گم گشتہ' (علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدون تحریریں) مرتبہ رحیم بخش شاہین مطبوعہ اپریل ۱۹۷۵ء ناشر، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، صفحات ۲۵۱ تا ۲۵۴ پر ڈاکٹر لطیف کا یہ مضمون ایک ''گنج گراں مایہ کی تلاش'' کے عنوان سے بہ حوالہ ہفت روزہ چٹان لاہور مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۶۷ء شائع ہوا۔)

○○○○

ڈاکٹر سید عبداللطیف
ترجمہ: از سید امتیاز الدین

اقبال کا مسلکِ انسانیت

(اقبال کی زندگی میں ۷ر جنوری ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد میں منعقدہ یوم اقبال میں ڈاکٹر لطیف نے یہ مضمون پیش کیا۔ جناب سید امتیاز الدین کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ادارہ)

اقبال صرف ایک عظیم شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک عظیم فلسفی بھی ہیں اور اکثر یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اقبال کی شاعری کو زیادہ اہم سمجھوں یا ان کی فلسفیانہ فکر کو۔ ایک زمانہ تھا جب اقبال کی شاعری کو نہایت شوق سے پڑھتا تھا، اس کی موسیقی ریزی کے متاثر ہوتا تھا۔ کبھی ان کے جذبے کی گہرائی میں جانے کی کوشش کرتا یا کبھی ان کے تخیل کی پرواز میں ساتھ دینے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب میں شاعری کو محض شاعری سمجھتا تھا۔ جوں جوں ماہ و سال گزرتے گئے، شاعری میرے لئے صرف جمالیاتی تسکیل کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ کچھ اور طلب کرنے لگی۔ ایسے لمحات بھی آئے جب میں نے اقبال کے فلسفے کی خوشہ چینی بھی کی اور دنیا، اس کی تاریخ اس کے مسائل اور اس کے مستقبل کو اقبال کے فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے دیکھا۔ میں اقبال کے شعری محاسن کو آج بھی محسوس کرتا ہوں اور ان کے فلسفے کی آواز آج بھی سنتا ہوں لیکن میں اقبال کی شاعری کو ان کے فلسفے سے الگ کر کے نہیں پڑھتا۔ میری نظر میں یہ دونوں جز ایک دوسرے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ آج جب میں اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے ذہن میں ایک تصویر ابھرتی ہے۔ اقبال ہم سے کیا کہتے ہیں۔ یہی میرا آج کا موضوع ہے اور میں اس کی ہلکی سی جھلک پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کہ اقبال نے مجھ پر کیا اثر چھوڑا ہے میں نے صوفیانہ سیاسی بصیرت (Political Mysticism) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ میرے خیال میں یہ

اصطلاح موجودہ تناظر میں فکر اقبال کی عکاسی کرتی ہے۔ زندگی کے ابدی پیام کو ایک مکمل نظامِ حیات کی طرح پیش کرتی ہے۔ جس کی آج سارے عالم انسانیت کو تلاش ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس عظیم الشان محفل میں سینکڑوں خواتین وحضرات ہوں گے جنہوں نے اقبال کو بار ہا پڑھا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اقبال اپنے دل کی بات بالکل سادہ اور سامنے کے لفظوں میں بیان نہیں کرتے۔ جاوید نامے میں خود اقبال اعتراف کرتے ہیں۔

ایں سخن آراستن بے حاصل است　　برنیاید آنچہ در قعرِ دل است
گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب　　نکتہ دارم کہ ناید در کتاب
گر بگویم می شود پیچیدہ تر　　حرف وصوت اُورا کند پیچیدہ تر

سوزِ اُو را از نگاہِ من بگیر
یا ز آہِ صبح گاہِ من بگیر

(خطاب بہ جاوید۔ سخنے بہ نژادِ نو)

ترجمہ: (از: پروفیسر سید سراج الدین)

یہ سخن آرائی بے حاصل ہے سب
بات دل کی لب تک آئی ہے کب
ویسے سو نکتے کئے میں نے بیاں
ایک نکتہ ہے جو، اب بھی ہے نہاں
اس کو کہہ ڈالوں اگر
کردیں حرف وصوت اسے پیچیدہ تر
پوشیدہ تر
سوز وہ میری نگاہ میں
یا مری آہِ سحر گاہی میں ڈھونڈ !

اس لئے اقبال کے کلام کی پُر سوز لئے کو ان کی نظر اور اس نالۂ نیم شبی میں ڈھونڈنا ہوگا جو ہر صبح ان کے لبوں پر ہوتا ہے، جب وہ آنکھ کھول کر اس عالم کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے مجھے لاہور میں انہیں کے دولت خانے پر ان کی اس آہِ صبح گاہی کے بارے میں کچھ بات

کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ نگاہ کیا ہے؟ وہ پرسوز لئے کیا ہے؟ اگر آپ ان کے کلام پر غور کریں تو آپ اس نگاہ کی کیفیت اور اس نغمے کے سوز کا یہاں سے بھی اندازکر سکتے ہیں۔

وہ نگاہ ایک سیاسی مبصر کی نگاہ ہے جو شاعر بن کر پیدا ہوا۔ وہ لئے، اس نغمۂ انسانیت کی لئے ہے جو احکام الٰہی سے روشن ہے۔ اگر چیکہ آج شاعر کا جسم لاغر ہے، لیکن اس کی دور بین نگاہ باقی ہے۔ جو قوم کی موجودہ تاریک زندگی میں آنے والے کل کا اجالا دیکھ رہی ہے جب انسانیت سماجی، سیاسی اور معاشی غلامی کی خود ساختہ زنجیروں سے آزاد ہوگی۔ یہ اقبال کی نگاہ ہے۔ اب ذرا اس آواز پر غور کیجئے جو اقبال کی آواز ہے۔ ایک تکلیف دہ عارضے نے اس آواز کو پست کر دیا ہے لیکن یہ بھرائی ہوئی آواز اس سوزِ دروں کو نہیں چھپا سکتی جو دنیا کی سماجی اور نسلی کشمکش اور قوم پرستی سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمیشہ تیار ہے۔ یہ طاقتیں مٹ کر رہیں گی۔ شاعر کی یہ دور بین نگاہ اور یہ نوائے صبح آنے والی نسلوں کو بیدار کرتی رہے گی کیونکہ یہ نگاہ اس انسانی کمزوری کو آشکارا کرتی ہے جسے قومی خودغرضی، لالچ اور کمزوروں کا استحصال کہا جاتا ہے۔ اقبال کی آواز اس ابدی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے جو اسے حق گو پیغمبروں کی وساطت سے ملی ہے جو نسلِ انسانی کے اتحاد کے لئے ہمیشہ مصروفِ عمل رہے۔

لوگوں نے اقبال کو طرح طرح کے نام دیئے ہیں۔ کسی کو جانے بغیر نام دے دینا آسان ہے۔ کسی نے انہیں فرقہ پرست کہا ہے اور کسی نے باغی۔ بعض لوگوں نے مہذب الفاظ میں دشنام طرازی کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اقبال ابتداء میں ہندوستانی قوم پرست تھے بعد میں کٹر مسلمان ہو گئے۔ بعض لوگ انھیں جارحیت پسند اسلام کی ایک علامت سمجھتے ہیں۔

آپ میری بات کا یقین کریں، بہت جلد اقبال ان وقتی ناموں سے مبرا ہو جائینگے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نام اقبال کی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتا۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے انھوں نے اسی کو قبول کیا جو ان کے بالکل سامنے تھا۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے جب کوئی بچپن کی حد سے نکل کر سن بلوغ کو پہنچتا ہے اور جوانی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے، اس کی سمجھ گرد و پیش تک محدود ہوتی ہے۔ وہ ہر بہتری کو اپنے اندر دیکھتا ہے۔ اسے اپنا گھر اپنے اطراف کا ماحول بیرونی دنیا سے زیادہ اہم لگتا ہے۔ ایسا ہی اقبال کے ساتھ بھی ہوا۔ جب تک ان کا شعور پختہ نہیں ہوا انہوں نے صرف ملک کا ترانہ گایا۔ وہ ایسا وقت تھا جب قومیت کی لہر پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کر رہی تھی۔ اس

وقت اقبال نے اپنے وطن اور اس کی خوبصورتی کے نغمے گائے۔ اس کے بعد ان کے سنِ شعور کا آغاز ہوا۔ انہوں نے یوروپ کا مشاہدہ کیا۔ جب وہ وطن لوٹے تو ان کے ساتھ مشاہدات بھی تھے اور تجربات بھی۔ اب ان کا ذہن پختگی کی طرف بڑھنے لگا۔ اگر آپ اقبال کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔ آپ اقبال کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ان کو بے رحمانہ سیاسی تجربے کا شکار نہیں بنا سکتے۔

میں نے اس شاعر کو ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور تلاش اور تجزیے کی راہوں سے گزرا ہوں۔ مجھے اس شاعر کے ذہنی سفر کی ہر منزل پر وہ ایک مکمل انسان دکھائی دیا ہے۔ اس کی انسان دوستی اس کے کلام کا سرچشمہ ہے۔ کبھی کبھی تو یہ انسان دوستی اس قدر واضح دکھائی دیتی ہے کہ اسے تسلیم نہ کرنا شاعر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اگر جاوید نامے کے روحانی سفر میں ہندوستان اس کو خوش بھی کرتا ہے اور ناخوش بھی تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس ملک کو انسانی زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر افسوس کرتا ہے تو اس کا سبب بھی وہی انسان دوستی ہے جو ان حالات پر افسردہ ہو جاتی ہے۔ اگر یورپ اسے خودغرض تو ہم پرستی کا شکار دکھائی دیتا ہے تو یہ بھی اقبال کی انسان دوستی ہے جو صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی خودداری کی بنیادوں پر کھڑی ہو اور اپنے آپ کو تنگ نظری، نسل پرستی اور قومی تفوق کے جذبے سے آزاد کرے اور افق تا افق عالمی برادری کے ایسے نظام کی بنیاد ڈالے جو رنگ و نسل کے فرق کے باوجود دنیا کو انسانیت کے وسیع تر رشتے میں باندھے کہ یہی وہ نظامِ عالم ہے جس کے اس دنیا میں قیام کے لئے اقبال نے اپنی شاعری کو وقف کر رکھا ہے۔

اقبال کا جذبۂ انسانیت ان کا بنیادی نظریہ ہے۔ تاریخ عالم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے انسانیت کی تحریکات سے ہمیشہ سے متاثر رہے ہیں۔ اقبال کی تحریروں میں مغرب کی تحریکات کے ساتھ ساتھ عیسائی اثرات اور ہندوستان اور قدیم ایران کے مسلک انسانیت کی جھلک ملتی ہے لیکن جس جذبۂ انسانیت نے اقبال کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ جزیرہ نمائے عرب اور مشرقِ وسطیٰ کا وہ حصہ ہے جہاں سے انسانی تاریخ کو عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مصلحین اعظم عطا ہوئے جنہوں نے رنگ و نسل اور ملکوں کی حد بندیوں کو جڑ سے مٹا دیا اور سارے عالمِ انسانیت میں ہم آہنگی اور بھائی چارگی کو پیدا فرمایا۔

اسی عالمگیر نظامِ انسانیت کی روشنی میں اقبال آج کی دنیا اور اس کے مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں، ہندوستان میں قوم پرستی کی بات انھیں بے وزن لگتی ہے۔ یہاں پر وہ عمومی اخلاقی بیداری انھیں دکھائی نہیں دیتی جو کسی بھی قوم کو متحد رکھ سکتی ہے۔ ہندوستان ان کو ایک چھوٹا ایشیا دکھائی دیتا ہے جہاں مختلف فرقے ہیں جو اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور کسی میں ضم ہونا نہیں چاہتے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جمہوریت اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسی عوامی بیداری جس کے ذریعے سے سماجی مساوات پیدا ہو ایک ایسا ایثار چاہتی ہے جس کے لئے فی الحال ہندوستان کے عوام تیار نہیں ہیں۔ اسی روشنی میں اقبال یوروپ کو دیکھتے ہیں اور یورپ کا منظر ان کو غم گین کر دیتا ہے وہ خضرِ راہ میں کہتے ہیں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات وحقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال کی یہ شعلہ فشانی اس لئے ہے کہ مغرب کی جمہوریت اقبال کے جذبۂ انسانیت سے میل نہیں کھاتی۔ سوویت روس کے کمیونسٹ طرزِ حکومت، فاشسٹ یا نازی حکومت کے لئے بھی اقبال کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مارکس انسانوں کی بھوک مٹانے کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہے جب کہ نطشے کمزوروں کا خاتمہ کرنے کو راہِ نجات سمجھتا ہے۔ لیگ آف نیشن کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ مجلس آپس میں مُردوں کے کفن تقسیم کر رہی ہے۔

اقبال کا جذبۂ انسانیت ان میں سے کسی کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ اقبال مغرب میں سائنس

کی ترقی کو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ مغربی سماج انسانیت سے عاری ہے۔ جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو مغرب قوم پرستی کے نام پر دھوکہ دے دیتا ہے۔ یورپ کی حرکیاتی زندگی کو بھی اقبال پسند کرتے ہیں لیکن ان کو رنج ہے کہ مغرب انسانیت کی فلاح کے لئے کوشاں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس جذبۂ انسانیت پر بھروسہ کرتے ہیں جو اسلام سے عبارت ہے۔ جب وہ سرزمینِ عرب مصر، شام، ترکی، ایران اور ہندوستان کے مسلمانوں پر نظر کرتے ہیں جو اس عالمگیر مسلک انسانیت کے وارث اور علمبردار ہیں تو خود ان میں اسلام کی خصوصیات نہیں دکھائی دیتیں۔ اقبال کو اندیشہ ہے کہ مغرب کا تیزی سے پھیلتا ہوا جذبۂ قوم پرستی ان مسلمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

لیکن اقبال آج بھی مایوس نہیں ہیں۔ وہ اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام کا مسلک انسانیت ابھی بھی ایک زندہ حقیقت ہے اور اس میں طاقت ہے کہ لوگوں کو جغرافیائی حدود والی قوم پرستی سے آزاد کرا سکے۔ اقبال یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یورپ خود بھی اپنی اس غلطی کو محسوس کرے گا کہ اس نے عیسائیت کی اخلاقی قدروں کو پامال کر کے انسانوں کو خودغرضی کی قائم کردہ حد بندیوں میں جکڑ دیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار مغربی قومیں بھی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرنے لگی ہیں۔ وہ یکجہتی جو انھیں عیسائی چرچ سے ملی تھی جو عیسیٰ علیہ السلام کی وسیع النظری اور انسانی بھائی چارہ کی اساس پر قائم تھی وہ مارٹن لوتھر کی تحریکات کے زیر اثر ختم ہوگئی اقبال کو اس بات کا یقین ہے کہ آج کی دنیا اپنی خودساختہ تہذیب کو خود اپنے ہاتھوں پارہ پارہ ہوتا ہوا دیکھے گی اور ایک بار پر اسی مسلکِ انسانیت کی طرف رجوع کرے گی جو بنی نوع انساں کو متحد اور یکجا کرے گا۔

اس وقت تک جہاں کہیں بھی ہو، چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں بنی نوع انساں کو اپنے عالمی مرتبت ورثے کی حفاظت کرنی چاہئے جو اسلام کے ہمہ گیر جذبۂ انسانیت پر مبنی ہے۔

○○○○

ڈاکٹر سید عبداللطیف
ترجمہ: سید امتیاز الدین

شاعر اقبال اور اس کا پیام

(ہندوستان کے نامور دانشور ڈاکٹر سچدانند سنہا نے ۱۹۴۷ء میں The Poet and His Message کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی اس کتاب پر ڈاکٹر لطیف نے تبصرہ لکھا تھا۔ جو ان کے جریدہ Clarion (کلیرین) میں شایع ہوا تھا۔ اس تبصرہ کا اُردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ ادارہ)

اپریل ۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو اردو داں طبقے بالخصوص مسلمانوں میں ان کی مقبولیت عروج پر تھی۔ تعلیمی اداروں اور ادبی حلقوں میں وہ مطالعے کا خاص موضوع تھے۔ رسائل میں ان کی شاعری، فلسفے اور مذہبی فکر پر مضامین اور تنقیدی جائزے شائع ہو رہے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں مسلمانوں میں ان کی تحریروں کی مقبولیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مسلم مبلغین اور سیاسی لیڈران کے اشعار کو نقل کرتے اور اپنی تقاریر کو اور اثر انگیز بناتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال سب کے ہیرو بن گئے تھے۔

ایسی تحسین آمیز فضا میں اقبال کا ناقدانہ جائزہ لینا کسی کے لئے بھی مشکل تھا وہ فضا آج بھی برقرار ہے۔ بے شک آج بھی اقبال کی عقیدت لوگوں کے دلوں میں اس قدر زیادہ ہے کہ شاید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو تسلیم شدہ ادبی معیارات کی روشنی میں اقبال کی شاعری اور فلسفہ کو پرکھنے میں کئی برس لگ جائیں گے۔ اسوقت شاید بہت بلند حوصلہ اور عالی ہمت لوگ ہی اقبال کو کم فہم مدح خوانوں اور اندھے عقیدت مندوں کے پنجے سے چھڑا سکتے ہیں تاکہ اقبال اپنی حقیقی سربلندی کے ساتھ دنیا کے سامنے آسکیں بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے کلام میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مروجہ ڈگر سے ہٹ کر چلنا کوئی آسان بات نہیں۔ لیکن اگر کوئی حق بات کہنے کی جرأت کرتا ہے تو پھر اسے ہر طرح کی ناخوشگواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ سچائی اپنے کو منوا کر رہے گی۔ ادبی ذوق کو پاکیزہ بنانے کے لئے ایسی آزمائش سے

گزرنا پڑتا ہے۔ ایسی کوشش کا انجام کیا ہوگا یہ کوئی کہہ نہیں سکتا لیکن اس سمت میں ''پہلے قدم'' کی اہمیت مسلم ہے یہ ہوسکتا ہے کہ کسی حقیقت کو ثابت کرنے کی کوشش میں ہم حد سے گزر جائیں یہ خطرہ ہر حال میں لگا رہتا ہے۔ لیکن کسی غلط نظریہ کو برداشت کر لینا ذہن انسانی کے لیے اور بھی خطرناک ہے۔ سچائی کی خاطر تھوڑی بہت مبالغہ آرائی کو جائز سمجھنا چاہئے۔ اس نقطہ نگاہ سے میں ڈاکٹر سچد انند کی تخلیق ''شاعر اقبال اور اس کے پیام'' کو مطالعہ اقبال کے لیے ایک ممتاز کوشش سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر سنہا ہندوستان کے چند گنے چنے فضلاء میں سے ہیں، وہ مشرق و مغرب کے ادب اور ادبی روایات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سنہا صاحب نے برسوں سے اقبال کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے اور اردو اور انگریزی میں اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی ان کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر سنہا کی بات کو وقیع اور قابلِ اعتنا سمجھنا چاہئے۔

ڈاکٹر سنہا کی کتاب پانچ سو صفحات پر محیط ہے اور اقبال سے متعلق کوئی اہم گوشہ ایسا نہیں جس پر انہوں نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ انہوں نے اقبال کی پوری زندگی، ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا نہ صرف عمومی جائزہ لیا ہے بلکہ اس جائزے کے لئے تفصیلی ابواب مقرر کئے ہیں۔ اپنے موضوع سے ان کی گہری دل چسپی انہیں مختلف مسائل کی طرف لے گئی ہے، جیسے مابعد الطبعیاتی مسائل، سیاسی اور مذہبی مسائل وغیرہ، ایک سطحی طالب علم شاید ایسے تجزیے کو غیر ضروری سمجھے، لیکن سچید انند صاحب کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لئے مسائل بھی بہت ضروری ہیں۔ اس کتاب میں سر امین جنگ، سر تیج بہادر سپرو، نواب مرزا یار جنگ اور ڈاکٹر امر ناتھ جھا کی تقریظات بھی شامل ہیں جو قاری کو نہ صرف ڈاکٹر سنہا کے ذہن تک پہنچنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ ایسے نکات فراہم کرتی ہیں جو خود اقبال فہمی میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر سنہا اس بات سے ناخوش ہیں کہ اقبال نے اردو کے بجائے فارسی کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ اقبال کی اردو شاعری فارسی سے مستفاد ہے اور انہوں نے اپنے ملک کی روایات کی بجائے ایسے استعاروں اور تلمیحات کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق دور دراز کے ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگی اور روایت سے ہے۔ اس نقطہ نظر کا اظہار ڈاکٹر سنہا نے اتنی بار کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف شاعر اقبال کے تعلق سے تعصبات کا شکار ہے۔

ڈاکٹر سنہا کی تحقیق کا مقصد حقیقت کی تلاش اور جستجو ہے لیکن کیا ان کا طریقہ کار درست اور موزوں ہے؟ مجھے لگتا ہے کہ یہ طریقہ مثبت سے زیادہ منفی ہے۔ مصنف نے نہایت تفصیل سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ اقبال کیا نہیں ہیں بجائے اس کے کہ اقبال کیا ہیں۔ شاید انھیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے یہی صورت بہتر نظر آئی۔ شاید وہ تعریف وتوصیف کی اس فراوانی سے بیزار آ گئے تھے جو اقبال کے چاہنے والے ان پر نچھاور کر رہے تھے اور اقبال کو شعر و ادب، فلسفہ سیاست اور مذہب کی عظیم ترین ہستی ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سنہا نے اپنے مقصد کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اقبال کے پرستاروں کو یہ بتلا دیا جائے کہ اقبال وہ نہیں تھے جیسا کہ انھیں ظاہر کیا جا رہا ہے، لیکن کیا مصنف کا رویہ متوازن ہے؟ یہ بات یقیناً اہم ہے کہ آپ یہ بتلا دیں کہ اقبال کیا نہیں تھے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ یہ بھی بتلائیں کہ اقبال کیا تھے۔ اس کوشش میں مصنف کا رویہ مبہم ہے۔ کتاب کے شروع سے آخر تک سچدانند سنہا ایک آمادۂ پیکار بت شکن کی طرح دندناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اقبال کو اردو اور فارسی شعرا کی کہکشاں میں کوئی اعلیٰ مقام دینے سے بھی کتراتے ہیں۔ ان کے خیال میں اقبال کے پاس نہ تمثیل ہے نہ رزم۔ ان کے پاس غنائیت بھی نہیں ان کا کہنا ہے کہ اقبال زیادہ ایک ناصحانہ رنگ کے شاعر تھے اور یہ ناصحانہ شاعری بھی لکریش، ورڈسورتھ یا براؤننگ سے بھی کم تر درجہ کی ہے۔ ان کے خیالات تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہیں اور آفاقی وسیع المشربی سے بعید ہیں۔ اقبال کے فلسفے میں بھی ان کو حجت اور مناظرے کی نزاعی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس طرح وہ اقبال کو کسی قابلِ قبول فلسفیانہ نظریئے کا علمبردار بھی نہیں سمجھتے۔ مصنف یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اقبال قرآن اور اسلام کے سچے اور معتبر ترجمان بھی نہیں بلکہ اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود بعد میں آنے والے تنگ نظر مذہبی رہنماؤں کے پیرو ہیں۔ انہوں نے پیرِ رومی سے بھی اسلام کا صحیح اثر قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر سنہا کو اقبال کی حب الوطنی پر بھی شبہ ہے وہ انہیں متعصب اور اسلامی اتحاد کی علامت سمجھتے ہیں۔ مزید برآں وہ اقبال کو انسان دوست بھی نہیں گردانتے کیونکہ اقبال نے اپنے آپ کو ایک مخصوص فرقہ اسلام سے وابستہ کر لیا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے اسے سمجھا اور وہ ہندومت سے متنفر تھے کیونکہ اس میں بت پرستی داخل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال ہندومت کے اعلیٰ اقدار اور انسانیت کے فروغ کی بنیادی تعلیمات کو بھی سمجھ نہیں سکتے تھے۔ یہاں یہ بات دلچسپی کی ہے کہ یہ ساری منفی جدوجہد

ایک خاص ٹکنیک کے تحت عمل میں لائی گئی ہے جسے میں گھماؤ پھراو کہہ سکتا ہوں۔ تقریباً ہر باب میں یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سنہا اپنے مطلب کی بات کافی رک رک کر کہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابتداء میں کچھ محفوظ تمہیدوں کا سہارا لیتے ہیں اور جب خاطر خواہ فضاء بنتی ہے تبھی کھل کر سامنے آتے ہیں دوسرے اہل قلم کے ارشادات نقل کرتے ہیں تا کہ قاری ان کی بات کو برداشت کر سکے یہ بلی کی طرح کی ہچکچاہٹ مجھے پوپ کے اس مشہور مقولے کی یاد دلاتی ہے۔ ''زخمی کرنے کی خواہش لیکن حملہ کرنے سے گریز'' یہ بات ایسے قاری کے لیے صبر آزما ہے جو ڈاکٹر سنہا سے یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں اور ان کے خیالات شاعر اقبال کے کلام کی کن شہادتوں پر مبنی ہیں؟

ڈاکٹر سنہا کا طریقۂ کار جو بھی رہا ہو، یہ اس بے جا مدح وستائش کا فطری ردّ عمل ہے جو اقبال کے پرستار کرتے رہے ہیں اب وقت آ گیا ہے کہ اقبال کے مداح بھی جاگیں اور اقبال کو اس تناظر میں دیکھیں جسے ڈاکٹر سنہا نے پیش کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بہت کچھ جو ڈاکٹر سنہا نے کہا ہے اس میں ان کی فطری مگر حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستی کو دخل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم ہندوستانی روایات میں زندگی کے تمام تر حقیقتیں پنہاں ہیں جن کو اقبال نے عمداً نظر انداز کیا ہے۔ ڈاکٹر سنہا کے مشاہدارت میں ضرورت سے زیادہ گرمی ہے۔ کچھ تو مذکورہ بالا وجہ سے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ ڈاکٹر سنہا نے اقبال کی پوری شخصیت اور فن کا کلی جائزہ لینے کے بجائے ان کا تجزیہ جزو اجزو اکیا ہے۔ یہ تکلیف کے بغیر کہ ان اجزاء کے اندر ربط تلاش کریں یا ایک عضوی کلّ کے طور پر انھیں دیکھیں۔ ڈاکٹر سنہا اپنی تلاش وتحقیق کے نتیجے میں ہماری توقعات پر پورا نہیں اترتے۔ اسی وجہ سے اقبال کی حقیقی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے نہ آسکی۔ انہوں نے صرف رائے عامہ کے دھارے کو متضاد سمت میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ ؎

سچائی کو ابھی آشکارا ہونا باقی ہے

○○○○

اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیاں

ڈاکٹر سہیل عمر ناظم اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) کی آمد

ڈاکٹر سہیل عمر ناظم اقبال اکادمی پاکستان اپنے دورۂ حیدرآباد کے موقع پر پہلی مرتبہ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے دفتر دومرتبہ ۱۷/و ۱۸/جنوری ۲۰۰۶ء کوتشریف لائے۔ یہاں کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی اور کتب خانہ کا معائنہ فرمایا جناب احمد جاوید صاحب نائب ناظم اقبال اکادمی پاکستان بھی موصوف کے ہمراہ تھے۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے رفقاء سے تبادلہ خیال ہوا، اس موقع پر پروفیسر سید سراج الدین صدر جناب محمد ظہیر الدین، نائب صدر جناب محمد ضیاء الدین نیّر معتمد، جناب سید امتیاز الدین شریک معتمد، جناب محمد عمر علی خان، جناب مضطر مجاز، پروفیسر یوسف کمال، جناب محمود قادری اور جناب وجیہ الدین احمد اور دیگر احباب موجود تھے۔ اس موقع پر موصوف نے مطبوعات کا تحفہ عنایت فرمایا۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی جانب سے اقبال کے اہم خطوط کے نقول وغیرہ بھی فراہم کئے گئے۔

ڈاکٹر سہیل عمر نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے کام سے شناسائی اور ارباب اکیڈیمی سے نیازمندی بہت دنوں کی تھی مگر کبھی حاضری کا موقع میسر نہ آیا تھا۔ الحمدللہ کل اور آج (۱۷/۱۸/جنوری ۲۰۰۶ء) اکیڈیمی میں حاضری کی مسرت حاصل ہوئی۔ احباب سے ملاقات بھی ہوگئی اور دونوں اداروں کے مابین اشتراکِ عمل اور باہمی تعاون کے سلسلے میں سیر حاصل گفتگو ہوئی اور متعدد منصوبوں پر ھمکاری کا پروگرام طئے پایا۔ ارباب اکیڈیمی اور ان کے رفقائے کار کی لگن، بے لوث اور انتھک خدمات اور ایثار نے ہمارے لئے مہمیز شوق کا کام کیا اور ہمت افزائی کا سبب ہوا۔ اکادمی کی جانب سے اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی سرگرمیوں کے لئے تعاون کی یقین دہانی کی گئی۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے اقبال اکادمی پاکستان کو علامہ اقبال کے نادر اور غیر مطبوعہ خطوط کا جو تحفہ اس موقع پر عطا کیا وہ ہمارے ''مخزن'' اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور جن مطبوعہ خطوط کی

نقول فراہم کی گئیں وہ بھی اکادمی کے جاری منصوبے ''کلیات نثر اقبال'' کے صحت متن کی ضمانت ہوں گی۔ میں اکیڈیمی کی قوت کار سمتِ سفر اور خوشحالی کے لئے دعا گو ہوں۔

۱۸ر جنوری ۲۰۰۶ء — محمد سہیل عمر

ناظم، اقبال اکادمی پاکستان (لاہور)

اجتماعات

گذشتہ ۶ ماہ کے عرصہ میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام حسب ذیل اجتماعات کا انعقاد عمل میں آیا۔

۱۔ ۲۰ر نومبر ۲۰۰۵ء توسیعی تقریر جناب عمر فاروق ممتاز صحافی و نامہ نگار بی بی سی،
موضوع: ''مسلم دنیا۔ عراق جنگ کے بعد''۔ صدارت: جناب میر ایوب علی خان بیورو چیف دکن کرانیکل۔

۲۔ ۱۱ر ڈسمبر ۲۰۰۵ء توسیعی تقریر جناب محمد ظہیر الدین
موضوع: ''حرم کعبہ۔ اقبال کی نظر میں''، صدارت جناب مضطر مجاز

۳۔ ۱۹ر فروری ۲۰۰۶ء توسیعی تقریر۔ جناب محمد عمر فاروق
موضوع: ''اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ''۔ صدارت: جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت و اسسٹنٹ جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ۔

○

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے اشتراک سے قائم شدہ اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کے تحت حسب ذیل اجتماعات منعقد ہوئے۔

۱۔ ۱۸ر ڈسمبر ۲۰۰۶/۱۸ء خصوصی اجتماع ''یادِ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم''

مقالہ نگار	موضوع
جناب محمد متین الدین قادری ریسرچ اسکالر	''خطبات بہاولپور۔ ایک مطالعہ''

- پروفیسر افضل الدین اقبال — ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی شخصیت خطوط کے آئینہ میں''
  سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
- پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمجید — ''عہد نبوی کا نظام تعلیم ۔ایک مطالعہ''
  پروفیسر شعبۂ عربی جامعہ عثمانیہ — (موصوف کے غیاب میں یہ مقالہ ڈاکٹر حسن محمد نقشبندی نے پیش کیا)
- جناب محمد اسحاق، ماہر تعلیم — ''عالم دین ۔محمد حمید اللہ''

صدارت: پروفیسر سید سراج الدین صدر اکیڈیمی

۲۲ر جنوری ۲۰۰۶ء۔توسیعی تقریر پروفیسر محمد خلیل اللہ ۔صدارت: ڈاکٹر سید عبدالمنان
موضوع: میڈکل سائنس کی ترویج وترقی میں مسلمانوں کا حصہ

○

اس کے علاوہ ہر چہار شنبہ کو مسجد عالیہ گن فاؤنڈری حیدرآباد میں محافل اقبال شناسی کا سلسلہ پابندی سے جاری ہے، جناب سید امتیاز الدین شریک معتمد اقبال اکیڈیمی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ان محافل کے انعقاد میں جناب غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ کی دلچسپی کا خاص دخل ہے۔اہل علم اصحاب کو اقبالیات سے متعلق کسی عنوان پر دعوت خطاب دی جاتی ہے۔

نئی مطبوعات

۱۔ اقبال ریویو۔نومبر ۲۰۰۵ء اقبال اور سید جمال الدین افغانی
اس خصوصی اشاعت پر پروفیسر عقیل ہاشمی کا تبصرہ اس شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔

۲۔ اقبال جہانِ نو کی تلاش میں ۔از ڈاکٹر یوسف اعظمی
(اس کتاب میں اقبالیات سے متعلق ۱۹ اہم مضامین شامل ہیں)
ناشر: اقبال اکیڈیمی حیدرآباد۔صفحات ۱۴۲، قیمت Rs.150=00

۳۔ ''جہانِ اقبال'' مرتبہ جناب محمد عبدالرحیم خان پرنسپل اردو آرٹس کالج
ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔ قیمت Rs.75-

کتب خانہ

کتب خانہ میں کئی نئی اور اہم کتابوں کا اضافہ ہوا۔ جن اصحاب علم نے کتب کا تحفہ عنایت فرمایا ہے ان کی خدمت میں اکیڈیمی ہدیہ تشکر پیش کرتی ہے۔

نادر کتب و مخطوطات کا تحفظ

سالار جنگ میوزیم کے تحت مخطوطات کے مرکز کی سرکردگی میں اقبال اکیڈیمی میں موجود تقریباً ایک سو سے زائد قلمی کتابوں اور مخطوطات کے تحفظ کا کام انجام دیا گیا جن میں سے بیشتر مخطوطات بوسیدہ حالت میں تھے، جن کی کیمیکل کے ذریعہ صفائی کی گئی اور لامنیشن کیا گیا۔ اس اہم کام کی تکمیل کے سلسلہ میں اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن اور اکیڈیمی جناب احمد علی سی سی کنزرویٹر سالار جنگ میوزیم کی ممنون ہے۔

اقبالیات پر ویب سائٹ

اقبال اکادمی پاکستان نے جدید عصری تقاضوں کے پیش نظر پیام اقبال کو عام کرنے کے لئے ایک بہت بڑی ویب سائٹ تیار کی ہے۔ اس ویب سائٹ پر اقبال کی اردو، فارسی تصانیف ان کے تراجم، خطاطی، تصاویر، حالات زندگی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ مزید برآں اکادمی کی تصانیف بھی علٰحدہ ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(i) www.allamaiqbal.com

(ii) www.iqbalurducyberlibrary.com

اسی طرح اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اور اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد، سرگرمیوں اور کتب خانہ میں موجود کتابوں کی فہرست وغیرہ درج ذیل ویب سائٹ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

(i) www.iqbalacademyhyd.com

(ii) www.ihfh.org

○○○○

تبصرہ نگار: ڈاکٹر عقیل ہاشمی
(سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی)

اقبال ریویو۔ اقبال اور سید جمال الدین افغانی نمبر پر تبصرہ

اقبال شناسی یا اقبال فہمی کی روایت کے بارے میں یہ بات کس قدر سچی ہے کہ اس کی شروعات خود علامہ اقبال کی حیات ہی میں ہو چکی تھی دکن میں خصوصیت سے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمہ اور ان کے بعد قائد محترم سید خلیل اللہ حسینیؒ کے علاوہ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور پروفیسر عالم خوندمیری اور ان سے آگے بھی کئی نام لئے جاسکتے ہیں۔ نیز اقبال اکیڈیمی کے مطمح نظر تو اقبال کی فکر بنیادی و اساسی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ اقبال ریویو نے وقتاً فوقتاً اقبالیات کے وقیع اور قابل قدر قومی و ملی اثاثہ کو آشکارا کرنے کی دانستہ و شعوری کوشش کی ہے اس سلسلے کی تازہ ترین کوشش ''اقبال اور سید جمال الدین افغانی'' کی خصوصی پیش کش ہے جب کہ اس سے قبل شارحین اقبال کا ایک یادگار نمبر شائع ہو چکا ہے۔

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے اس ششماہی ترجمان اقبال ریویو میں کل چھ مضامین ہیں جب کہ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کی تقریر بعنوان ''افغانی کا پیام'' بھی شامل ہے۔ اس شمارے کے بارے میں لکھتے ہوئے ادارے نے اس امر کا اعادہ کیا کہ ''اقبال پر افغانی کی شخصیت اور ان کی انقلابی فکر کے اثرات کا اظہار ہمیں پہلی مرتبہ خطبات میں نظر آتا ہے، خصوصاً جاوید نامہ میں افغانی کے افکار کی روح، اقبال کی تخلیقی سفر کا جزو بن گئی ہے محکماتِ عالم قرآنی زمانی فصل کے باوجود دونوں کے درمیان فکری ہم آہنگی کا اہم ثبوت ہے، چنانچہ شمارہ کے مشمولات میں پروفیسر مبارز الدین رفعت کی کتاب ''مقامِ جمال الدین افغانی'' سے دو مضامین، نقوشِ اقبال مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو سے ایک کے علاوہ اقبال اکاڈیمی پاکستان اور ''اقبال اور عظیم شخصیات'' مرتبہ طاہر تونسوی تخلیق مرکز لاہور سے دو مضامین ماخوذ ہیں ابتدائی تین مضامین سید جمال الدین افغانی کی حیات وسیرت اور ان کے مشن پین اسلامزم سے متعلق ہیں جب کہ باقی

تین مضمونوں میں اقبال اور افغانی کی فکری یکسانیت، جذبۂ حریت، سامراجی وفسطائی قوتوں کے خلاف اسلامی جہاد و اجتہاد پر گفتگو ملتی ہے اقبال افغانی کے ارادت مندوں میں تھے جب ہی تو جاوید نامہ جوان کی مضبوط و پختہ فکر وشعور کی نمائندہ مثنوی ہے اس کی شروعات ہی میں اقبال نے پیر رومی کی رہنمائی میں عالم افلاک کی روحانی سیر کی ہے فلک عطارد پر اقبال جسے رومی از راہ شوخی ''زندہ رود'' کہتے ہیں کی ملاقات جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح سے ہوتی ہے اس ملاقات میں افغانی دین و وطن کی بحث میں مغرب کے تصورِ وطنی قومیت کے معائب اور سفاکانہ اعمال پر روشنی ڈالتے ہیں اور سعید حلیم پاشا مشرق ومغرب کے اختلافات پر۔ اس تمام گفتگو کو اقبال جاوید نامہ میں ان دونوں حضرات کی زبانی وطنیت ملوکیت اور اشتراکیت پر تنقید کرتے ہیں اور ان ملحدانہ و مادہ پرستانہ نظام ہائے سیاست کو نسل انسان کی تباہی کے راستے بتا کر اسلام کے معاشرتی و معاشی عدل کی فضیلت واضح کی ہے، اقبال کا کہنا ہے کہ مسلمان اس وقت ضعف ایمان اور نا امیدی کا شکار ہیں، چند بڑے بڑے فتنے جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ کر رکھا ہے وہ افرنگ مآبی، ملوکیت کا استبداد اور اشتراکیت ہے اور یہ امور، روحانی اقدار باہمی انسانی ہمدردی اور احساس اخوت کے لئے زہر ہلال ہیں۔ اقبال کی نظر میں قرآن مجید میں ہر عصر کی کامل رہنمائی موجود ہے مگر اس کی خاطر اجتہادی نقطہ نگاہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اس پوری ارتکازی فکر کے لئے اقبال نے جمال الدین افغانی سے اکتساب کیا حالانکہ افغانی کی شخصیت کے بارے میں زعماء وقت کا یہ احساس تھا کہ وہ عبقری سرتاپا انقلاب واصلاح کا نقیب، سیماب صفت ملکوں کی سرحدوں سے آزاد، قوم پرست سیاسی، صحافی آزادی وحریت کا دلدادہ فراست ودانائی کا پیکر تھا جس نے مغرب کی چیرہ دستیاں، سازشوں کے خلاف انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا، انحطاط مشرق کے کئی اسباب وعلل کی نشاندہی کی سامراجیت نے اس کو اپنے لئے مستقل خطرہ محسوس کیا۔ آثار جمال الدین افغانی کے حوالہ سے کہا جاسکتا ہے کہ افغانی اپنی سرشت میں ایک ایسے شعلہ جوالہ کی طرح سرزمین افغان سے اٹھے اور مصر، ایران، ترکی، عراق، مراقش، بخارا، ترکستان اور کسی حد تک ہندوستان میں آزادی وحریت کی آگ برساتے ہوئے گذر گئے۔ جمال الدین افغانی کی یہی انفرادیت کیا کم ہے کہ سرحدوں اور ملکوں کے امتیازات کے قطع نظر ان کے پیام کو سنا گیا، ان کی عظمت و بزرگی کو مانا گیا ان کے اصلاحات یا پھر فکر وانقلاب کو اہمیت دی گئی کیونکہ وہ جانتے تھے

کہ اسلام ہر زمانے میں انسانی صلاح و فلاح کے لئے آیا ہے وہ نوع انسانی کا کفیل ہے اسلام اعتدال وتوازن کا دوسرا نام ہے ادیان میں فرد وملت کے ربط کا مسئلہ عمدہ طور پر اسلام ہی نے حل کیا۔ اسلام فرد کی نفسیات کے کسی پہلو کو جماعت کے مفاد سے الگ نہیں کرتا اس کی تمام عبادات میں اجتماعی عنصر بہت نمایاں ہیں بنی نوع انسان کی وحدت کی تعلیم قرآن میں موجود ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگراند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی باجماعت یار باش — رونق ہنگامۂ احرار باش

اقبال ریویو کے اس خصوصی شمارہ میں ابوالکلام آزاد کی تحریر محض معلوماتی ہے اور اسی میں اس بات کا پتہ چلا کہ ''ہندوستان میں تو الہلال کی اشاعت سے پہلے غالباً لوگ سید جمال الدین کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔'' جب کہ مبارز الدین رفعت نے ''شاہین سید'' کی توجیہ کرتے ہوئے افغانی کی ذات وصفات کی تشریح کی ہے بقول مضمون نگار ''ان کی جلوت تو پورے مسئلہ شرق کی تاریخ ہے لیکن ان کی خلوت گزینی اور کم آمیزی کا بھی حال آپ کو کچھ معلوم ہے وہ خلوت گزینی جس کے متعلق خود انہی کی زبان سے اقبال نے ادا کرایا۔

مصطفیؐ اندر حرا خلوت گزید — مدتی جز خویشن کس را ندید
گرچہ داری جان روشن چون کلیمؑ — ہست افکار تو بے خلوت عقیم
از کم آمیزی تخیل زندہ تر — زندہ تر جوئندہ تر تابندہ تر

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مضمون میں اولاً افغانی سے اقبال کی ملاقات کی تفصیل جاوید نامہ ہی کی روشنی میں ملتی ہے، بلکہ مولانا ندوی نے جاوید نامہ ہی کی تشریحات کو اپنے طرز واسلوب میں لکھا ہے جو افغانی کا پیام تھا۔ یعنی آج دنیا کو اس امت کی ضرورت ہے جو وعدہ وعید، رحمت و شدت، نرمی وگرمی دونوں رکھتی ہو۔ تم مشرق سے روحانیت و مذہبیت لو کیونکر مغربی مذہب پرستی کھوکھلی ہو چکی ہے''۔ ..... تم نے خرافاتِ عالم کو سطر سطر مٹادی ہے اس لئے تمہیں اب قرآن کا حرف حرف پڑھنا چاہئے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن ملوکیت و آمریت کا جانی دشمن اور سرمایہ داری کی موت ہے اور غاموں، مزدوروں اور مجبوروں کے لئے زندگی۔ وہ ضرورت سے زائد سرمایہ غریبوں پر خرچ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ سود کو حرام، تجارت کو حلال کرتا اور قرض حسنہ اور صدقہ جاریہ پر لوگوں کو ابھارتا ہے۔ کیا دنیا کے فتنوں اور بے رحمیوں کا سرچشمہ سود نہیں۔''

آفریدی شرع و آئینے دگر! اند کے بانورِ قرآنش نگر!
از بم و زیرِ حیات آگہ شوی ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

خصوصی شمارہ ''اقبال اور سید جمال الدین افغانی'' کے یہ تین مضامین اصلاً اقبال اور افغانی کے ربط و تعلق ذہنی، یگانگت اور نظریات کی یکسانیت کی جانب کھلے اشارے کرتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار حضرات جن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر محمد ریاض اور ڈاکٹر معین الدین عقیل شامل ہیں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اقبال اور افغانی کے احوال و آثار سے زیادہ ان قدرے مشترک امور کی جانب توجہ دلائی ہے جو ان دونوں نابغۂ روزگار شخصیتوں میں ودیعت کئے گئے تھے، جیسے قرآن حکیم سے فطری مناسبت، مغربی استعماریت کے خلاف جذبات حریت، خصوصیت سے افغانی کے پان اسلام ازم کے بارے میں اقبال کے خیالات، جنہیں تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے خطبات میں بیان کیا ہے، کیونکہ افغانی کی خداداد استعداد اور قابلیت کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے وہ ایک ترقی پسند اور ہمہ گیر اجتہادی نقطہ نظر کے حامل نتائج سے بے پروا بیباک، حق گو، اسلامی اتحاد و اخوت اور مشترکہ دفاعی قوتوں کو مجتمع کرنے والی شخصیت تھے چنانچہ کاتکوف روسی، ارنسٹ ریناں، بلنٹ اور ای جی برون جیسے متشرقین ان کی معنوی صفات سے بے حد اثر پذیر ہوئے۔ ارنسٹ ریناں نے لکھا کہ اس نے ایسا منفرد اور انقلابی مسلمان پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، براؤن نے انہیں ایک زبردست صحافی، صاحبِ قلم، عظیم، فکر، خطیب اور سیاست داں کے طور پر یاد کیا اور علامہ اقبال نے اس بندۂ مومن کی آفاقی شان دکھائی، جاوید نامہ میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہ افغانی کے خیالات کی بازگشت ہے، جب کہ حکیمانہ افکار کی وسعتیں قاری کو اقبال اور افغانی میں مماثلت کی دعوت دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بڑی وضاحت سے اقبال اور افغانی کے مابین موجود قدروں کا جائزہ لیا ہے، انہوں نے کم وبیش ہر مرحلہ پر مختلف صاحبانِ فکر کی کتابوں سے حوالے دیئے اور بتلایا کہ اقبال افغانی سے اس حد تک متاثر تھے کہ جب انہوں نے جاوید نامہ میں ایک تصوراتی اسلامی مملکت کا خاکہ پیش کیا تو اسکے لئے انہوں نے افغانی کو اس کا ذریعۂ اظہار بنایا۔

سید السادات مولانا جمالؔ زندہ از گفتارِ اُو سنگ وسفال
عالمے در سینۂ ما گم ہنوز عالمے در انتظار قم ہنوز

واضح رہے کہ اقبال نے اپنی فکر کی بنیاد اسلام کے عقائد اور حکمائے اسلام کی حکمت پر رکھی، اس ضمن میں انہوں نے مولانا رومیؒ سے راست استفادہ کیا۔ اس منزل پر اقبال کو افغانیؒ کے نظام فکر میں جو قدر مشترک نظر آئی وہ ان کی اصلاح و تجدد کی مساعی تھیں افغانی نے اس کام کے لئے اپنے جوہر تقریر و تحریر (صحافت) کو کام میں لایا ہندوستان خصوصاً حیدر آباد کے قیام کے دوران ہفتہ روزہ ''العروۃ الوثقی'' کے بیشتر مضامین کے اردو ترجمے شائع ہوئے۔ ہندوستان میں وہ سیاست سے بالکل علیحدہ رہے لیکن سرسید، محمد علی جوہر اور پھر بعد کو اقبال ان کے مشن و فکار سے متاثر و مویدر ہے جن کا نعرہ تھا۔

امت مسلم ز آیات خداست　　اصلش از ہنگامہ قالوا بلیٰ است
در جہاں بانگ اذاں بود است و ہست　　ملت اسلامیاں بود است و ہست

عبارت مختصر! اقبال ریویو کا یہ خصوصی شمارہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اقبال اور افغانی کے افکار و نظریات میں ایک گوناں مماثلت پائی جاتی ہے، اگر چہ کہ افغانی کے معاملات انہیں ملکوں ملکوں لئے پھرتی رہی۔ علم و فضل، سیاست و صحافت سے الجھتے ہوئے انہوں نے بلاد اسلامیہ میں بیدرای کی ایک لہر دوڑا دی ان کے خیالات میں بنی نوع آدم کے لئے اگر کوئی عالمگیر مذہب ہوسکتا ہے تو وہ اسلام ہے نیز افغانی اجتہاد پر زور دیتے ہیں، مغرب کی ریشہ دوانیوں، استعماریت کے غلبہ کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی اور انہوں نے تعلیمی میدان میں اصلاح کو بھی ناگزیر جانتے ہوئے یہ اور ایسی کئی جہات میں ہم اقبال کو ان کا ہمدم و ہمقدم پاتے ہیں اقبال نے بھی کئی طریقوں (شاعر) سے مغربی تہذیب اور نظریہ حیات پر مخالفانہ مگر حکیمانہ تنقیدیں کی اقبال کے نزدیک قرآن ہی ایک کتاب ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو متحد کر سکتی ہے۔

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم　　حکمت اُو لایزال است و قدیم
حرف اُو را ریب نے تبدیل نے　　آیۂ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیام آخریں　　حاملِ اُو رحمۃ للعالمینؐ

بہر حال افغانی اور اقبال کی سیرت و احوال، نیز ان کے افکار کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان دونوں نے اسلام کی سربلندی اس کی عظمت کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا، اقبال ریویو کا یہ خصوصی شمارہ یقیناً ان عظیم ہستیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک کامیاب ذریعہ ہے جس کے لئے اقبال اکیڈیمی مبارکباد کی مستحق ہے۔　　○○○○

ڈاکٹر محمد سہیل عمر ناظم اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) جناب محمد ظہیر الدین سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر محمد سہیل عمر ناظم اقبال اکادمی پاکستان اور احمد جاوید نائب ناظم، پروفیسر سید سراج الدین، جناب محمد ظہیر الدین اور جناب محمد ضیاء الدین نیئر

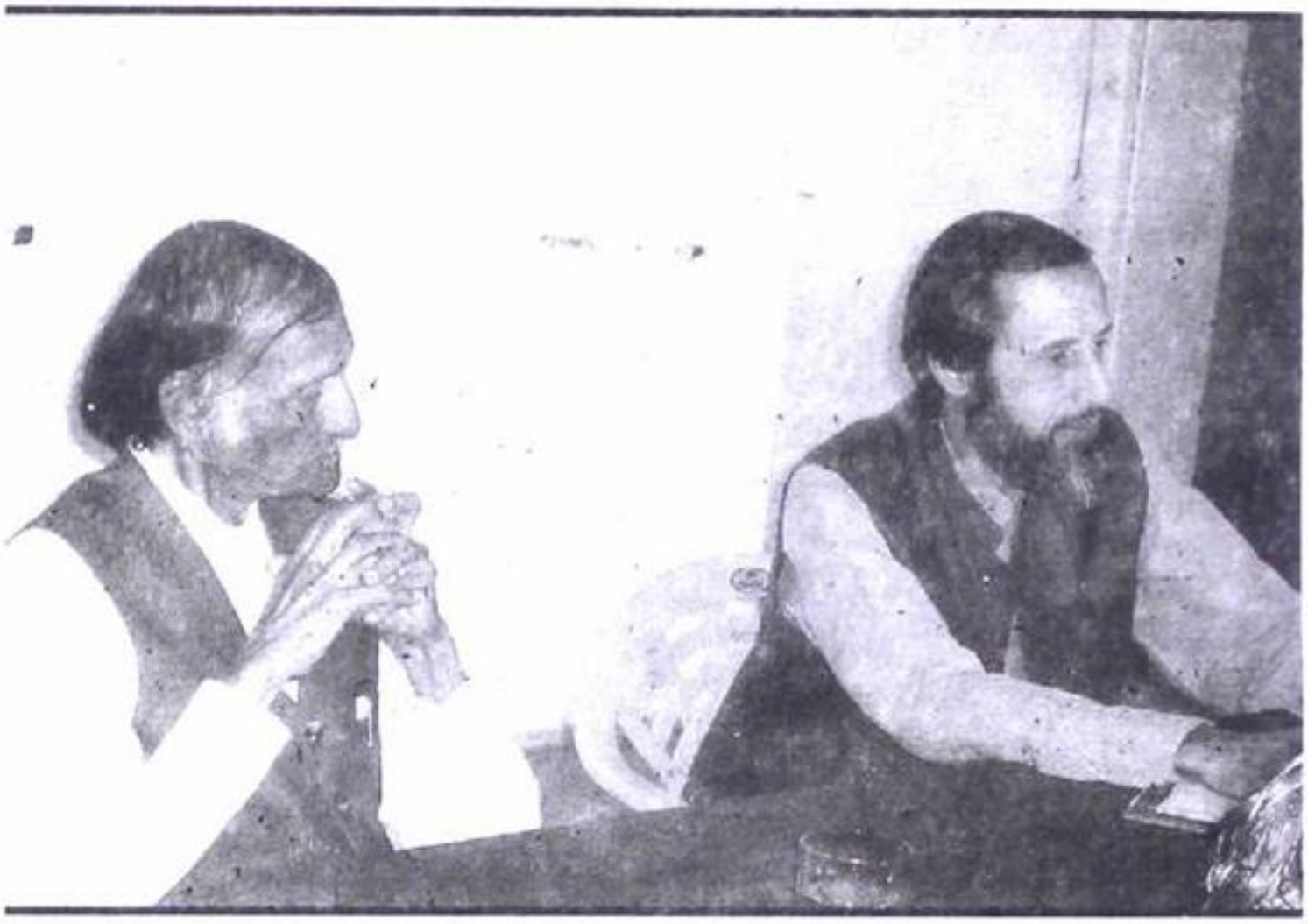

ڈاکٹر محمد سہیل عمر اور پروفیسر سراج الدین صدر اکیڈیمی۔

پروفیسر محمد خلیل اللہ، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور جناب محمد عمر علی خان نائب صدر فاؤنڈیشن

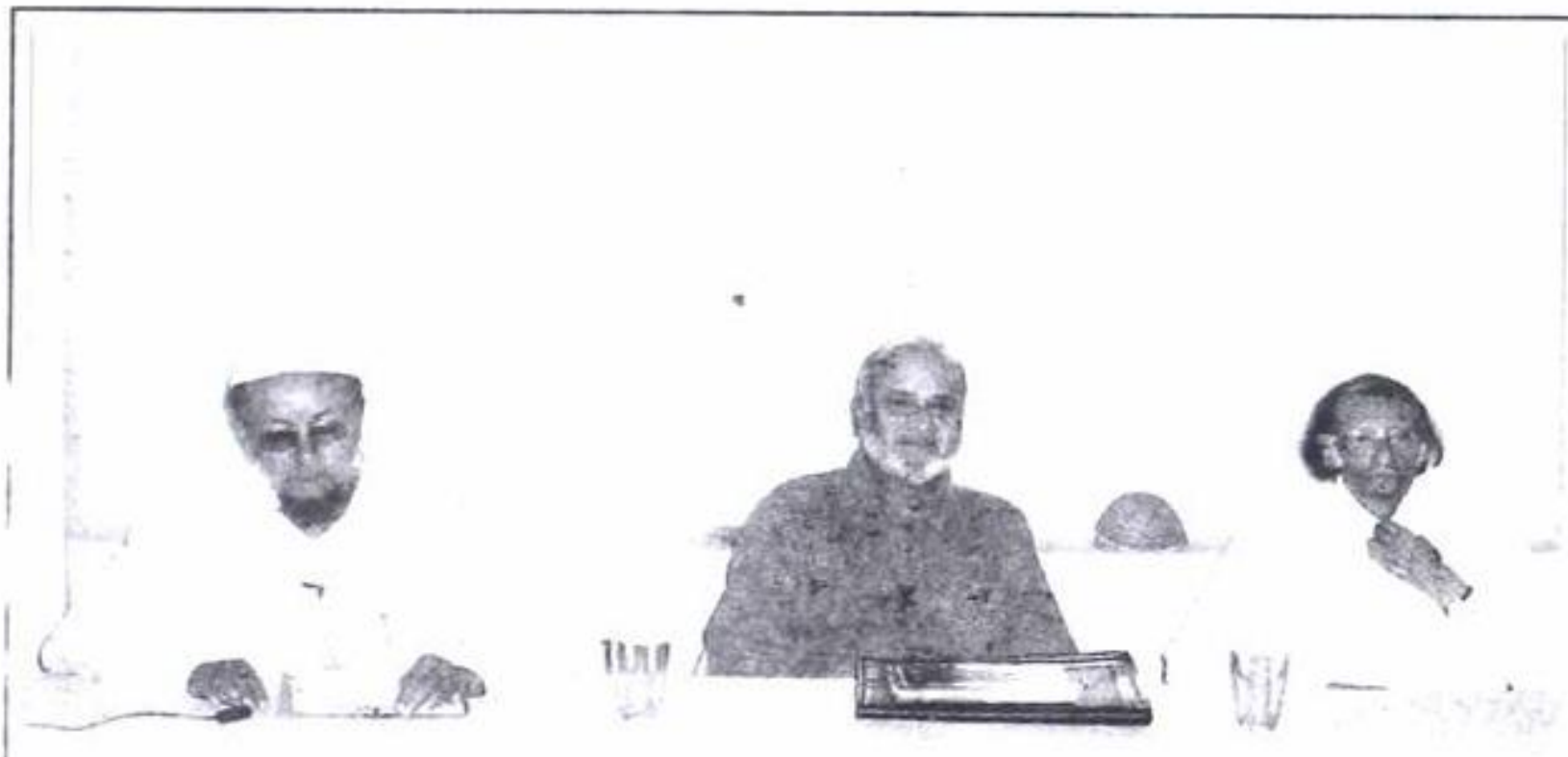

(دائیں سے بائیں) پروفیسر سید سراج الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب،
جناب سید امتیاز الدین شریک معتمد۔

(بائیں سے دائیں) جناب محمد عمر فاروق توسیعی تقریر کے موقع پر، اور جناب میر ایوب علی
خاں چیف بیورو دکن کرانیکل

Vol :15 Issue : 1
April 2006

ISBN : 81-86370-30-7
Phone : 55663950

"IQBAL REVIEW"

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

IQBAL ACADEMY

Gulshan-e-Khaleel, 10-5-7/1, Masab Tank, Hyderabad - 500 028, A.P. INDIA